انجمن طلبۂ قدیم جامعۃ الفلاح کا ترجمان

ماہنامہ

جریدہ

حیاتِ نو

دہلی

مدیر اعزازی : محمد انس فلاحی مدنی

جلد۔۹ ، شمارہ ۔ ۷۔۹ | جولائی۔دسمبر۲۰۲۳ء | ذوالحجۃ۔جمادی الاخری ۱۴۴۵ھ

ادارتی امور کے لیے رابطہ کریں: 9634920066 | انتظامی امور کے لیے رابطہ کریں: 9634920066

ای میل: Hayatenau1978@gmail.com

فی شمارہ	:	اندرون ملک	۳۰/روپے
		بیرون ملک	۵/امریکی ڈالر
خصوصی شمارہ	:		۱۰۰/روپے
سالانہ زرتعاون	:	اندرون ملک	۳۰۰/روپے
		بیرون ملک	۲۰/امریکی ڈالر
لائف ممبرشپ	:	اندرون ملک	۵۰۰۰/روپے
		بیرون ملک	۳۰۰/امریکی ڈالر

مجلس ادارت

۱۔ڈاکٹر ضیاء الدین ملک فلاحی
۲۔عبداللہ زکریا فلاحی
۳۔تنویر آفاقی فلاحی
۴۔امتیاز وحید فلاحی
۵۔عبدالرحمٰن زریاب فلاحی
۶۔نجم الہدیٰ ثانی

ہمارے نمائندے

۱۔ظفر احمد اثری، لندن
۲۔موسیٰ کلیم فلاحی، متحدہ عرب امارات
۳۔حسن حبیب فلاحی، نیپال
۴۔فیاض احمد فلاحی، قطر
۵۔محمد سموئیل فلاحی، کویت
۶۔ڈاکٹر انعام اللہ فلاحی، سعودی عرب
۷۔ذوالقرنین حیدر فلاحی، ملیشیا

★ رجسٹرڈ ڈاک سے رسالہ منگوانے کی صورت میں رجسٹری خرچ بذمہ خریدار ہوگا۔

★ مقالہ نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

Printed, Published & Owned by Sayyed Rashid Hamdi ,F-9, Zeeshan Apartment, 1st Floor, Near Masjid Al-Habeeb, 40 FT Road, Shaheen Bagh, Jamia Nagar, Okhla, New Delhi-110025.
Printed at: Ala Printing Press, 3636, Katra Dina Baig, Lal Kuan, Delhi-110006. **Published at**:F-9, Zeeshan Apartment, 1st Floor, Near Masjid Al-Habeeb, 40 FT Road, Shaheen Bagh, Jamia Nagar, Okhla, New Delhi-110025. **Editor:** Mohd Anas Falahi

نقوشِ حیات

اداریہ	محمد انس فلاحی مدنی	۷
پیغام	ابوالاعلی سید سبحانی	۱۳
اچھی زندگی! اچھی موت!	مولانا محمد عنایت اللہ اسد سبحانی	۱۵
معمار جامعہ: ڈاکٹر خلیل احمد مرحوم	مولانا شبیر احمد فلاحی	۱۸
جامعۃ الفلاح کے عظیم محسن	پروفیسر ملک حبیب اللہ فلاحی	۲۵
ہم چلے جائیں گے ترے شہر کی گلیوں سے دور	جناب ایس عبداللہ	۲۸
میرے مربی میرے محسن	مولانا محمد عمران فلاحی	۳۲
ڈاکٹر خلیل احمد صاحبؒ: نقوش وتاثرات	مولانا نعیم الدین اصلاحی	۳۹
ڈاکٹر خلیل احمد صاحب کا سانحۂ ارتحال	مولانا محمد طاہر مدنی	۴۵
مرحوم ڈاکٹر خلیل احمد صاحب کی یاد میں	ڈاکٹر ابوشحمہ	۴۸
میرے محسن میرے مربی	ماسٹر شاہ نواز	۵۰
ڈاکٹر خلیل احمدؒ: عمل اور جہد مسلسل کا ایک نام	مولانا محمد اسماعیل فلاحی	۵۵
ڈاکٹر خلیل احمدؒ: بہترین معالج اور تحریکی رفیق	ڈاکٹر تابش مہدی	۶۰
آہ! ڈاکٹر خلیل احمد مرحوم	وسیم احمد بروی	۶۷
ہمارے ڈاکٹر صاحب!	اطہر ریحان فلاحی	۶۹
تعلیم کے شیدائی: ڈاکٹر خلیل احمدؒ کی یاد میں	ڈاکٹر محی الدین غازی	۷۳
جس رخ سے بھی پڑھیں گے انھیں جان جائیں گے	حافظ دانش فلاحی	۷۵
آہ! ڈاکٹر خلیل احمد صاحب مرحوم	اطہر احسن فلاحی	۷۸

ڈاکٹر خلیل احمدؒ: میرے دادا، میرے دوست	ڈاکٹر خان یاسر	۷۹
ڈاکٹر خلیل احمد: شہر میں اک چراغ تھا نہ رہا	ڈاکٹر عمر خلیق	۱۱۴
آہ! وہ ہمیں چھوڑ گئے	خان طاہر	۱۲۷
آہ! خاموشی سے کام کرنے والے ڈاکٹر خلیل احمدؒ	شاہد علیگ	۱۲۹
آہ! میرے نانا	خبیب شاہد شیخ	۱۳۱
والد محترم: کچھ یادیں کچھ باتیں	درخشاں خلیل	۱۳۳
ابا مرحوم	عظمیٰ خلیل	۱۳۶
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا	ڈاکٹر فاطمہ عتیق الرحمٰن	۱۳۸
اک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا	خان صائمہ عتیق الرحمٰن خان	۱۴۱
شمع روشن بجھ گئی بزم سخن ماتم میں ہے	صوفیہ خان فلاحی	۱۴۵
میرے خالو (ڈاکٹر خلیل صاحب)	ثمینہ شاہ نواز	۱۴۸
اس ایک شخص میں تھیں دلربائیاں کیا کیا	ڈاکٹر سمیہ ریاض فلاحی	۱۵۰
منظوم خراج عقیدت	شاہد حسن	۱۵۶
ڈاکٹر خلیل احمدؒ کی رحلت پر تعزیتی نشست کا انعقاد	مصباح الباری فلاحی	۱۵۸

مصور کا قلم عاجز ہے، اور کیوں نہ ہو!
سب سے بڑا چیلنج یہی ہے کہ تصویر کس کس زاویے سے بنائی جائے؟
علم کی ایسی قدر،
مطالعے کا ایسا بلند ذوق،
تربیت کا ایسا حکیمانہ انداز،
تعلیم و تعلم کے لیے ایسی بے مثال جدوجہد،
تحریک کے لیے ایسی جانثاری،
عزائم کی ایسی بلندی،
رویے میں ایسی انکساری،
ہم عصروں سے ایسی محبت،
نئی نسل کی ایسی فکر،
اصولوں پر ایسی سختی،
انداز میں ایسی شیرینی،
معاملات میں ایسا کھرا پن،
جذبات پر ایسا قابو،
طرز زندگی میں ایسی سادگی،
راہ خدا میں ایسی سخاوت،
بیت المال کے تئیں ایسی احتیاط،
شہرت و ناموری سے ایسی بے نیازی
گلشنِ اطفال کا ایسا مالی۔۔۔
آہ! اُن کی ہر اک ادا بے نظیر تھی۔

(**صفحہ ۱۱۳**)

شرکاء کا تعارف

ابوالاعلی سید سبحانی	صدر انجمن طلبہ قدیم، جامعۃ الفلاح، بلریا گنج، اعظم گڑھ
مولانا محمد عنایت اللہ اسد سبحانی	استاذ الاساتذہ جامعۃ الفلاح
مولانا شبیر احمد فلاحی	رکن مجلس شوری، جامعۃ الفلاح
پروفیسر ملک حبیب اللہ فلاحی	پلسوانیا امریکہ
ماسٹر الیس عبداللہ	سابق استاد، جامعۃ الفلاح
مولانا محمد عمران فلاحی	معاون مہتمم، جامعۃ الفلاح
مولانا نعیم الدین اصلاحی	شیخ التفسیر، جامعۃ الفلاح
مولانا محمد طاہر مدنی	سابق ناظم، جامعۃ الفلاح
ڈاکٹر ابوشحمہ	معتمد مال، جامعۃ الفلاح
ماسٹر شاہ نواز	صدر شعبہ ابتدائی، جامعۃ الفلاح
مولانا محمد اسماعیل فلاحی	سابق شیخ التفسیر جامعۃ الفلاح
ڈاکٹر تابش مہدی	معروف شاعر و ادیب، نئی دہلی
جناب وسیم احمد بروی	لکھنؤ
جناب اطہر ریحان فلاحی	ہدی اسلامک گرلس کالج، جگدیش پور
ڈاکٹر محی الدین غازی	سکریٹری جماعت اسلامی ہند و مدیر ماہنامہ زندگی نو، نئی دہلی
جناب اطہر احسن	میرٹھ
حافظ دانش فلاحی	معروف سماجی کارکن، اعظم گڑھ

ڈاکٹر خان یاسر	ڈائریکٹر انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز اینڈ ریسرچ، نئی دہلی
ڈاکٹر عمر خلیق	تجزیہ نگار برائے فارسی و دری زبان، فیس بک، حیدرآباد، تلنگانہ
خان طاہر	انڈین انسٹیٹیوٹ آف ماس کمیونیکیشن (IIMC)
شاہد علیگ	ڈاکٹر خلیل مرحوم کے داماد
خبیب شاہد شیخ	ڈاکٹر خلیل مرحوم کے نواسے
محترمہ درخشاں خلیل	ڈاکٹر خلیل مرحوم کی صاحبزادی
عظمیٰ خلیل	ڈاکٹر خلیل مرحوم کی صاحبزادی
ڈاکٹر فاطمہ عتیق الرحمٰن خان	ذاکر نگر، نئی دہلی
خان صائمہ عتیق الرحمٰن	اسسٹنٹ پروفیسر، ایم ایس ڈگری کالج، ممبرا
محترمہ صوفیہ خان فلاحی	میرا روڈ، ممبئی
محترمہ ثمینہ شاہنواز	سابق معلّمہ، کلیۃ البنات، جامعۃ الفلاح
ڈاکٹر سمیہ ریاض فلاحی	اراضی باغ، اعظم گڑھ
جناب شاہد حسن	ممبئی
مولانا مصباح الباری فلاحی	استاذ شعبۂ اعلیٰ، جامعۃ الفلاح

ڈاکٹر خلیل احمدؒ: خدمت کا قابل رشک جذبہ

جامعۃ الفلاح کے قیام واستحکام میں ابتدائی طور پر جن لوگوں کا نام آتا ہے ان میں ڈاکٹر خلیل احمد مرحوم کا نام بھی شامل ہے۔ انھوں نے اعلیٰ تعلیم علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سے حاصل کی۔ اس کے بعد بلریا گنج میں ہی اپنا مطب کھولا۔ تحریک اسلامی سے وابستہ ہوئے اور جامعۃ الفلاح کے لیے اپنے آپ کو لگا دیا۔ انھوں نے زندگی کا بڑا عرصہ اس ادارے سے کسی نہ کسی طرح وابستہ رہ کر اس کی خدمت کرتے ہوئے گزارا۔ ان کی زندگی کی سرگرمیوں کا ایک بڑا محور یہی ادارہ تھا۔ ان کے غور وفکر اور تگ ودو کا حاصل جامعۃ الفلاح کی تعمیر وترقی کے سوا کچھ نہ تھا۔ ان کے جانے سے ادارہ اپنے ایک دیرینہ بہی خواہ سے محروم ہو گیا ہے۔

ڈاکٹر خلیل احمد نیک طبیعت، سادہ مزاج، اور شگفتہ انداز کے مالک تھے۔ جب بھی ملتے تو مسکراتے، خلاف حق کوئی بات برداشت نہیں کرتے، کمزور اور مظلوم کی دادرسی کرتے، سماجی، تعلیمی اور دینی خدمت کا قابل رشک جذبہ تھا۔ ان کی شخصیت کے یہ نمایاں اوصاف تھے۔ ان کا جانا دراصل ایک ایسے شخص کا جانا ہے جس کی زندگی کا محور دین اور دینی تعلیم تھا، اور جس کی آرزوؤں اور تمناؤں کا مرکز جامعۃ الفلاح تھا۔ اس ادارہ کی تعمیر وترقی کے نہ جانے کتنے خواب انھوں نے دیکھے تھے۔

ڈاکٹر مرحوم کی شخصیت میں اخلاص وللّٰہیت، خدا ترسی، ہمدردی اور ایثار وقربانی کا ایسا جذبہ تھا کہ کسی کمزور اور مجبور کو دیکھتے تو اس کی مدد کو دوڑ پڑتے، یتیموں سے ایسی محبت اور ہمدردی تھی کہ ان کے لیے اپنی زمین وقف کر کے گلشن اطفال کی داغ بیل ڈالی۔ یوں تو ڈاکٹر مرحوم کی شخصیت اپنی گوناگوں سماجی اور دینی خدمات کے طفیل خطہ اعظم گڑھ میں مشہور ومقبول تھی، لیکن واقعہ یہ ہے کہ تحریک اسلامی، جامعۃ الفلاح اور قصبہ بلریا گنج کے لیے ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔

جامعۃ الفلاح اور تحریک اسلامی کے لیے جدوجہد ان کی زندگی کا ایک ایسا حصہ ہے، جسے

بھلایا نہیں جا سکتا، یہی وجہ ہے کہ جب ان کی وفات کی خبر سوشل میڈیا پر نشر ہوئی تو تحریک اسلامی اور جامعۃ الفلاح کے وہ سپوت، جنھیں ڈاکٹر مرحوم کی سرپرستی حاصل رہی، سخت صدمے سے دوچار ہوئے۔ کئی ایک نے مختصراً تعزیتی تحریریں بھی سپردِ قلم کیں۔

جامعۃ الفلاح کے لیے ان کی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے، انھوں نے اس کی تعمیرات، تعلیمی معیار اور یونیورسٹی سے الحاق کے لیے انتھک جدوجہد کی۔ تین میقات اس کے ناظم رہے اور تادم حیات شوریٰ کے رکن رہے۔ جو ذمہ داریاں بھی تفویض ہوئیں، بحسن وخوبی انجام دیں اور ہر جگہ فعال کردار ادا کیا۔ جامعۃ الفلاح کے لیے کہیں بھی سفر ہوتا تو ناگزیر صورت میں کم سے کم پر گزارے کی کوشش کرتے۔ کوشش کرتے کہ سفر خرچ کا بار مدرسہ پر نہ پڑے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر خلیل احمدؒ ان لوگوں کے لیے ایک مثال کہے جاسکتے ہیں جو دینی وملی کاموں کے لیے اسراف کرتے رہتے ہیں اور ان کے چہروں پر شکن تک نہیں آتی۔

اللہ تعالیٰ نے ڈاکٹر خلیل احمد مرحوم کو طویل عمر عطا کی، آخری عمر تک صحت مند رہے۔ ڈاکٹر صاحب چاہتے تو اپنے پیشہ طب سے خوب کما سکتے تھے، لیکن ان کا مزاج ہی کچھ ایسا تھا کہ وہ اس کو خدمت خلق کا ذریعہ سمجھتے تھے اور اپنی پوری زندگی خدمتِ خلق میں گذار دی۔ ڈاکٹر مرحوم کی زندگی کا یہ پہلو قابلِ رشک ہے کہ سماجی ودینی سرگرمیوں اور مصروفیات کے باوجود انھوں نے اپنے اہل خانہ سے کبھی لاپروائی نہیں برتی، ان کی اچھی تعلیم وتربیت کے لیے ہر ممکن کوشش کی۔ یہ کہنا بجا ہے کہ ڈاکٹر صاحب مرحوم نے اپنے پیچھے ایک ایسی نسل چھوڑی ہے، جو ان کے لیے صدقہ جاریہ بنے گی۔ اللہ تعالیٰ ڈاکٹر صاحب مرحوم کی قبر کو نور سے منور کردے اور ان کی دینی وسماجی خدمات کو توشۂ آخرت بنائے۔

☆☆☆

ڈاکٹر مرحوم کا انتقال ہوا تو صدر انجمن جناب ابوالاعلیٰ سید سبحانی نے ''ڈاکٹر خلیل احمدؒ: حیات وخدمات'' حیات نو کا خصوصی شمارہ نکالنے کا حکم دیا۔ حکم کی تعمیل میں اس کا اشتہار نکالا گیا۔ ۴۰ سے زائد لوگوں کو خطوط ارسال کیے گئے۔ مضامین موصول ہونے کی تاریخ طے ہوئی، چند لوگوں نے وقت مقررہ کی پابندی کے ساتھ مضامین ارسال کردیے، بعض نے قدرے تاخیر سے مضامین بھیجے اور بعضوں سے ہم مضامین حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہوسکے۔ حق تو یہ تھا کہ مرحوم سے وابستہ حضرات ان کی زندگی

کے مختلف مخفی پہلوؤں کو اجاگر کرتے ، ان سے وابستہ حسین لمحات سپردِ قلم کرتے ، ان کی جفاکشی کے واقعات بیان کرتے ،اور جامعۃ الفلاح اور تحریک اسلامی کے لیے ان کی بےلوث خدمات کو سراہتے ، لیکن افسوس ایسا نہ ہوسکا۔

اس شمارے میں ۲۹ مضامین شامل ہیں ،جن میں ان کے ہم عصر ،احباب ،اعزہ واقارب ، ان کے پوتے ،نواسے ، پوتی اور نواسی کے مضامین بھی شامل ہیں۔کئی ایک مضامین ایسے ہیں ،جن کے مطالعہ سے مرحوم کی زندگی کے ایسے مخفی گوشے سامنے آئیں گے ، جو بہت سے لوگوں کے لیے بالکل نئے ہوں گے۔ان مضامین میں مرحوم سے متعلق نقوش وتأثرات کا گلدستہ جمع ہوگیا ہے،اس میں ان سے وابستہ یادوں اور تذکروں کے ساتھ سبق آموز باتیں شامل ہیں جو بعد میں آنے والے لوگوں کے لیے یقیناً مشعلِ راہ ہوں گی۔

یہ خصوصی شمارہ غیر معمولی تاخیر سے منظر عام پر آرہا ہے،اس کی کئی وجوہ ہیں ، بڑی وجہ تو یہی ہے کہ مضامین غیر معمولی تاخیر سے موصول ہوئے ، کچھ میری دیگر علمی مصروفیات بھی تاخیر کا باعث ہوئیں۔

محمد انس فلاحی مدنی

بہت سے لوگ اپنی پوری زندگی ذاتی اور خانگی الجھنوں میں گزار دیتے ہیں۔ان کی ساری فکریں خود ان کے گرد گھوم رہی ہوتی ہیں۔سماج کو سدھارنے اور دنیا کو خوبصورت بنانے میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوتا ہے۔

بہت سے لوگ ایسی دنیاؤں کی فکریں دل میں پالے رہتے ہیں جہاں ان کی کچھ نہیں چلتی ہے۔ان کی زندگی بڑی بڑی فکروں سے بھری ہوتی ہے، لیکن کسی کوشش سے خالی ہوتی ہے۔وہ دنیا میں پھیلے بگاڑ کا شکوہ تو بہت کرتے ہیں لیکن بگاڑ دور کرنے میں کوئی رول ادا نہیں کرتے ہیں۔

کم لوگ ہوتے ہیں جو اپنی ذات سے اوپر اٹھ کر اپنے قریب کی اس دنیا کے بارے میں سوچتے اور فکر کرتے ہیں جہاں وہ کچھ کر سکتے ہیں۔ایسے لوگ صرف سوچتے نہیں ہیں بلکہ بہت کچھ کر دکھاتے ہیں۔کیوں کہ وہ اپنے لیے ایسا دائرہ کار منتخب کرتے ہیں جہاں وہ بہت کچھ کرنے کی پوزیشن میں ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر خلیل احمد مرحوم نے اپنی پوری زندگی اپنے دائرہ اثر میں سوچتے اور کرتے ہوئے گزاری۔اس پہلو سے وہ اپنے بہت سے معاصرین میں نمایاں اور ممتاز تھے۔

(صفحہ ۷۳)

ڈاکٹر خلیل احمد مرحوم

نام: خلیل احمد

والد کا نام: عبدالحمید خان

تاریخ ولادت: یکم نومبر ۱۹۳۳ء (بہ مطابق سرکاری ریکارڈ)
گھر کے ریکارڈ کے مطابق ۱۹۳۱ء

وطن: بلریا گنج

گھرانہ: قاضی خاندان

تعلیم: مقامی مکتب جامعہ اسلامیہ، درجہ چہارم تک
گورنمنٹ سکنڈری اسکول، بلریا گنج، ۱۹۳۴ء سے، درجہ پنجم تا ہفتم
مشنری اسکول وسلی انٹر کالج اعظم گڑھ، ۱۹۴۶ء سے، انٹرمیڈیٹ تک

طب کی تعلیم: بی یو ایم ایس، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ۱۹۵۶ء

شادی: ۱۹۴۹ء میں، شاہ پور، عظمت النساء خاتون بنت مسعود خان سے

حج بیت اللہ: پہلا حج ۱۹۷۲ء، دوسرا حج ۱۹۸۹ء اور تیسرا حج ۲۰۰۷ء کے اواخر میں۔

۱۹۶۲ء میں جامعۃ الفلاح کی تاسیس میں پیش پیش رہے۔

بعد میں جامعہ کے ناظم بھی منتخب ہوئے، نائب ناظم اور مہتمم بھی رہے۔

اس کے علاوہ جامعہ کی مجلس انتظامیہ کے تاحیات رکن تھے اور مجلس عاملہ کے بھی متعدد میقاتوں میں رکن منتخب ہوتے رہے۔

جامعۃ الفلاح کی نظامت:

دور اول ۱۹۶۳ء سے ۱۹۶۹ء

دور ثانی ۱۹۹۰ء سے ۱۹۹۳ء

دور ثالث ۱۹۹۶ء تا ۲۰۰۰ء

جامعہ کے اہتمام کی ذمہ داری: ۱۹۹۹ء تا ۲۰۰۰ء، تقریباً ایک سال۔
ایک زمانے تک شبلی کالج، اعظم گڑھ کی مجلس انتظامیہ اور مجلس عاملہ کے رکن رہے۔
گلشن اطفال بلریا گنج کے بھی بانی اور صدر رہے۔
مسجد بلال تعمیر کرائی اور پھر زندگی بھر اس کی تولیت کے فرائض انجام دیتے رہے۔

اولاد:

چار بیٹے:

۱۔ عتیق الرحمٰن
۲۔ انیس الرحمٰن
۳۔ خلیق الرحمٰن
۴۔ عبید الرحمٰن

تین بیٹیاں:

۱۔ درخشاں
۲۔ لبنیٰ
۳۔ عظمیٰ

انتقال پر ملال: ۲۸ اور ۲۹ مئی کی درمیانی شب ۲۰۲۳ء
نماز جنازہ و تدفین: بعد نماز عصر ۲۹ مئی ۲۰۲۳ء

صدر انجمن کا پیغام

اس کے مقاصد جلیل!

.....ابوالاعلی سید سبحانی.....

ڈاکٹر خلیل احمد مرحوم پر جریدہ حیات نو کا خصوصی شمارہ پیش خدمت ہے۔

ڈاکٹر خلیل احمد مرحوم اللہ رب العزت کی ایک نشانی تھے۔ اِس کائنات میں یہ بھی اللہ رب العزت کی ایک بڑی نشانی ہے کہ وہ اپنے بندوں کے درمیان سے وقتاً فوقتاً کچھ ایسے فکرمند اور ہوش مند بندوں کو کھڑا کر دیتا ہے، جو اللہ کے بندوں کی فلاح و بہبود کے لیے اپنی پوری پوری زندگیاں لگا دیتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب ایسے ہی ایک عظیم انسان تھے، بہت ہی عظیم انسان، ایک ایسا انسان جس نے پوری زندگی اللہ کے بندوں کی فلاح و بہبود کے لیے جدوجہد کرتے ہوئے گزار دی۔

ڈاکٹر خلیل احمد مرحوم کا نام جماعت اسلامی ہند، جامعۃ الفلاح اور خطہ اعظم گڑھ میں دینی و تعلیمی تحریک کے حوالے سے ایک عظیم کردار کا نام تھا، یہ کردار روحانی بھی تھا، اخلاقی بھی تھا، حرکی بھی تھا، دعوتی بھی تھا، ملی بھی تھا، اور ان سب کچھ کے ساتھ ساتھ زمینی اور حقیقی بھی تھا۔ ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کے اندر یہ تمام کردار متحرک نظر آتے تھے۔

ڈاکٹر خلیل احمد مرحوم جماعت اسلامی ہند کے قدیم ترین ارکان میں سے تھے، اور جماعت کے لیے خاص طور پر مقامی سطح پر، آپ کی خدمات بہت ہی غیر معمولی تھیں، افراد کی تیاری کا معاملہ ہو یا وسائل کی فراہمی کا مسئلہ ہو، ڈاکٹر صاحب ہر محاذ پر پیش پیش رہتے تھے۔

ڈاکٹر خلیل احمد مرحوم ہمیشہ میدان عمل میں ایکٹیو رہے، ملت کے لیے آپ کے اندر غیر معمولی فکرمندی پائی جاتی تھی، تعلیمی محاذ سے خاص طور پر دلچسپی رکھتے تھے، اور جب تک صحت رہی اس محاذ پر غیر معمولی خدمات انجام دیتے رہے۔

ڈاکٹر خلیل احمد مرحوم جامعۃ الفلاح کے اولین معماروں میں سے تھے، اور آپ تادم زیست یعنی تقریباً ساٹھ سال تک کسی نہ کسی صورت میں جامعۃ الفلاح کی خدمت انجام دیتے رہے، کبھی ناظم رہے، کبھی نائب ناظم رہے، کبھی مہتمم اور ناظم دونوں رہے، جامعہ کی مجلس شوری کے تاحیات رکن تھے، جامعہ کی

مجلس عاملہ کے بھی ایک زمانے تک رکن رہے۔ڈاکٹر صاحب ان مخلص اور سچے لوگوں میں سے تھے جن کو کام کرنے کے لیے کسی عہدے اور منصب کی ضرورت نہیں تھی، وہ جامعہ کے سچے خادم تھے، وہ جامعہ کے تعلق سے ایک خواب اور وژن رکھتے تھے، اور اس کے لیے ہمیشہ فکرمند رہا کرتے تھے، بہت سے ذمہ داران آئے اور چلے گئے، جامعہ کی تاریخ میں بہت سے اُتار چڑھاؤ آئے، لیکن ڈاکٹر صاحب کا جامعہ کے ساتھ جو تعلق پہلے دن قائم ہوا تھا وہ آخری سانس تک برقرار رہا۔ جامعۃ الفلاح کے تعلیمی نظام اور وہاں کے نصاب تعلیم اور طریقہ تدریس سے متعلق ایک واضح سوچ اور ایک واضح فکر رکھتے تھے، جدید وقدیم کے درمیان ایک حسین امتزاج دیکھنا چاہتے تھے، فارغین جامعہ کو فارغین مدارس کے درمیان ایک اعلی اور ممتاز مقام پر دیکھنا چاہتے تھے، اور مختلف نشستوں اور ملاقاتوں میں اس کا کھل کر اظہار بھی کیا کرتے تھے۔

ڈاکٹر خلیل احمد مرحوم گلشن اطفال بلریا گنج کے بانی تھے، یہ اعظم گڑھ میں یتیموں کی کفالت کے حوالے سے اپنی نوعیت کا پہلا ادارہ تھا، اس کے لیے ڈاکٹر صاحب نے نہ صرف زمین وغیرہ مہیا کرائی، بلکہ مستقل اس کی سرپرستی بھی فرماتے رہے۔

ڈاکٹر خلیل احمد مرحوم نے آخری عمر میں بلریا گنج میں ایک مسجد تعمیر کرائی تھی، ڈاکٹر صاحب اس مسجد کو اپنی نوعیت کی ایک مثالی مسجد بنانا چاہتے تھے، مسجد کے ساتھ آپ نے ایک لائبریری بھی قائم کی تھی، آپ چاہتے تھے کہ محلے کے طلبہ کا یہ مرکز ہو، طلبہ یہاں بیٹھ کر پڑھائی کریں، امتحان کے ایام میں وہاں ٹھہر کر امتحان کی تیاری کریں۔ آپ وہاں بوقتِ ضرورت امامت بھی فرماتے اور درس بھی دیتے۔ گلشن اطفال اور یہ مسجد آخری زمانے میں آپ کی توجہ اور دلچسپی کا خاص مرکز رہی۔ سچ بات یہ ہے کہ آپ کی شخصیت روحانیت اور حرکیت کا ایک حسین سنگم تھی۔

اس شمارے میں ڈاکٹر صاحب مرحوم کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر گراں قدر تحریریں موجود ہیں۔ صحیح معنوں میں یہ شمارہ ڈاکٹر صاحب مرحوم کے انجمن طلبہ قدیم، فارغین جامعہ اور وابستگان جامعہ کے ساتھ دیرینہ رشتے اور گہرے قلبی تعلق کو ایک معمولی سا خراج عقیدت ہے۔

اس کی امیدیں قلیل، اس کے مقاصد جلیل
اس کی ادا دلفریب اس کی نگہ دل نواز

اللہ رب العزت اس کوشش کو قبول فرمائے اور اس شمارے کی تیاری میں شریک تمام افراد کو جزائے خیر سے نوازے۔ آمین یارب العالمین

اچھی زندگی! اچھی موت!

مولانا محمد عنایت اللہ اسد سبحانی

ڈاکٹر خلیل صاحب مرحوم کو گئے ہوئے کئی ماہ ہو گئے، مگر وہ برابر یاد آتے ہیں، بلریا گنج جائیں تو ان کی کمی شدت سے محسوس ہوتی ہے۔ جامعۃ الفلاح کے در و دیوار آج بھی انہیں یاد کرتے ہیں۔

وہ جامعۃ الفلاح کے پہلے ناظم تھے۔ جامعہ کی ترقی کے لیے انہوں نے اپنا خون پسینہ ایک کر دیا تھا۔ بلریا گنج بازار میں ان کی کلینک تھی۔ جوں ہی کلینک سے فرصت ملتی، وہ جامعۃ الفلاح پہنچ جاتے۔ وہ جامعۃ الفلاح پر زیادہ سے زیادہ وقت گزارنے کی کوشش کرتے۔ وہ جہاں بھی رہتے جامعۃ الفلاح ان کے دل و دماغ پر سوار رہتا۔

وہ نہایت مخلص انسان تھے۔ جامعۃ الفلاح کے لیے جو دوڑ دھوپ کرتے، اس میں ان کی کوئی غرض شامل نہیں ہوتی۔ انہوں نے جامعۃ الفلاح کے لیے بہت کچھ کیا، مگر کبھی اس سے کوئی فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی۔

بات نامکمل رہے گی اگر ڈاکٹر خلیل صاحبؒ کے ساتھ ان کے دو دوستوں کا بھی ذکر نہ کیا جائے۔ ان کے ایک دوست تھے حاجی عبدالمتین صاحبؒ، اور دوسرے دوست تھے شیخ منیر صاحبؒ۔ یہ تین ستارے تھے، جو جامعۃ الفلاح کے افق پر برابر چمکتے نظر آتے تھے۔

یہ تینوں ستارے عموماً ایک ساتھ رہتے۔ اور جامعۃ الفلاح کی رونق کا باعث ہوتے۔ جامعۃ الفلاح کی تعمیر و ترقی میں ان تینوں ستاروں کا بہت اہم رول رہا ہے۔ حاجی عبدالمتین صاحبؒ ڈاکٹر خلیل صاحبؒ کے بعد ناظم ہو گئے تھے۔ اور شیخ منیر صاحبؒ برسوں جامعۃ الفلاح کے معتمد مال رہے۔

یہ تینوں جامعۃ الفلاح کے نہایت بے لوث خادم تھے۔ ان تینوں کے زمانے میں جامعۃ الفلاح نے دن دونی رات چوگنی ترقی کی۔

ڈاکٹر خلیل صاحب مرحوم کی خدمات جامعۃ الفلاح تک ہی محدود نہیں رہیں۔ جامعہ کی نظامت سے سبک دوش ہونے کے بعد بھی وہ تعلیم وتربیت کے کام سے وابستہ رہے۔قصبہ بلریا گنج کے اندر ہی انہوں نے بچوں کی تعلیم وتربیت کے لیے ایک ادارہ قائم کیا، جس کا نام ''گلشن اطفال'' رکھا۔

بلاشبہہ ''گلشن اطفال'' کے قیام میں دوسرے لوگ بھی شریک رہے، لیکن اس میں ڈاکٹر خلیل صاحبؒ کا کلیدی رول رہا ہے۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم نے بلریا گنج میں ہی خود اپنی زمین پر ایک خوب صورت سی مسجد تعمیر کرائی، اور یہ مسجد خاص اپنی آمدنی سے تعمیر کرائی۔ اور اپنی بیماری اور کمزوری کے زمانے میں بھی اس مسجد کو آباد رکھتے رہے۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم بڑی خوبیوں کے انسان تھے۔ وہ اپنے سینے میں ایک دردمند دل رکھتے تھے۔ وہ ملی اور سماجی مسائل میں پوری دلچسپی لیتے تھے۔ وہ جماعت اسلامی ہند کے قدیم رکن تھے۔ جماعت کی ترقی کے لیے وہ فکرمند رہتے تھے۔ اور اس کی تمام سرگرمیوں میں شریک رہتے تھے۔

ڈاکٹر خلیل صاحب مرحوم ان لوگوں میں سے تھے، جن سے راقم الحروف بہت قریب تھا، اور دل سے انہیں عزیز رکھتا تھا۔ ان کے اندر ایک خوبی ایسی تھی جس نے مجھے ان کا گرویدہ بنا دیا تھا۔ ان کے والد محترم نے لمبی عمر پائی تھی، اور آخر میں وہ بہت حد تک معذور ہو گئے تھے۔ اس معذوری کی حالت میں ڈاکٹر صاحب جس طرح ان کی خدمت کرتے تھے وہ قابل رشک تھی۔

جس طرح ایک ماں اپنے چھوٹے بچے کے ہاتھ منھ دھلاتی ہے، اور اس کے دوسرے بہت سے کام انجام دیتی ہے، ڈاکٹر صاحب مرحوم بالکل اسی طرح ان کے ہاتھ منھ دھلاتے، انہیں غسل کراتے، اور ان کے کپڑے تبدیل کراتے۔

ایک بار کا واقعہ ہے، میں ڈاکٹر صاحب مرحوم کے پاس موجود تھا، جب وہ اپنے معذور والد کی خدمت میں مصروف تھے۔

معذور والد نے ہنستے ہوئے دیہاتی زبان میں ڈاکٹر صاحب سے کہا: خلیل! تم ہی ہمارے باپ ہو، میں تمہارا بیٹا ہوں!

میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو ٹپکنے لگے، میں نے ڈاکٹر صاحب سے کہا:

کاش میں نے اپنے والدین کی زندگی میں آپ کو اس طرح اپنے معذور باپ کی خدمت کرتے ہوئے دیکھ لیا ہوتا۔

آہ! میں تو اپنے والدین کی کچھ بھی خدمت نہیں کر سکا۔

اللہ تعالی میری کوتاہیوں کو معاف کرے۔ اور ڈاکٹر خلیل صاحب مرحوم کو ان کی خدمتِ والدین کا بھرپور صلہ عطا فرمائے۔

قابل لحاظ بات یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے کئی جوان بیٹے اور بیٹیاں ہیں۔ اور وہ سب کے سب نیک اور فرماں بردار ہیں۔ وہ اپنے بچوں سے بھی اپنے معذور باپ کی خدمت کروا سکتے تھے، لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا، اور خود خدمت والدین کا عملی نمونہ بچوں کے سامنے پیش کیا۔

لطف کی بات یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے بیٹوں کو اپنے بزرگ باپ کی خدمت کا زیادہ موقع نہیں ملا۔ ڈاکٹر صاحب نے بھی لمبی عمر پائی، مگر وہ معذور نہیں ہوئے۔ جس رات میں ان کا انتقال ہوا، انھوں نے بچوں اور کچھ مہمانوں کے ساتھ رات کا کھانا تناول فرمایا، ان سے بات چیت کرتے رہے۔ پھر کھانے سے فارغ ہو کر اپنے بستر پر لیٹے اور گھنٹے دو گھنٹے میں روح پرواز کر گئی، اور کسی کو اس وقت پتہ بھی نہیں چلا۔

حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر خلیل صاحب مرحوم کی زندگی بھی قابل رشک تھی اور موت بھی قابل رشک تھی۔

رب کریم ان کی لغزشوں سے درگزر فرمائے، ان کی نیکیوں کا بھرپور صلہ عطا فرمائے۔ اور ان کی نیک اولاد کو ان کے لیے صدقہ جاریہ بنائے، آمین

سر خاک حیبے برگھائے لالہ می پاشم
کہ جانش با نہال ملت ما ساز گار آمد

معمار جامعہ: ڈاکٹر خلیل احمد مرحوم

مولانا شبیر احمد فلاحی

اس مکتب کو علوم اسلامیہ کا عظیم مرکز بنانے کا تخیل سب سے پہلے ڈاکٹر خلیل احمد مرحوم ہی کے ذہن میں آیا۔ اس کا آغاز کیسے ہو یہ سب سے بڑا مسئلہ تھا۔ لیکن آپ مسلسل اس میں سرگرداں رہے۔ اس کے لیے علماء کی ضرورت تھی، اس دور میں یہ آسان کام نہیں تھا، مولوی محمد عیسیٰ اپنے دوست مولوی رحمت اللہ مظاہری کے ساتھ تشریف لائے، چند ماہ بعد آب وہوا راس نہیں آئی۔ مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ نے بھی تدریس شروع کی، چند ماہ بعد وہ بھی چلے گئے۔ اکرام منزل (مودودی ہوسٹل) کی تعمیر مکمل ہوچکی ہے۔ ڈاکٹر خلیل احمد پریشان ہیں، بیٹھے ہیں مریضوں کے درمیان مطب میں لیکن دل ودماغ ہے قبرستان میں۔ فکرمند ہیں کہ یہاں زندگی کی ہوا کب چلے گی۔

مدرسۃ الاصلاح کے استاذ مولانا محمد ایوب اصلاحی کا ایک دن ورودِ مسعود ہوا۔ ان سے دوران ملاقات کسی عالم دین کا پتہ مانگا، آپ نے مولانا شبیر احمد اصلاحیؒ سے رابطہ قائم کرنے کا مخلصانہ مشورہ دیا۔ ان کی شخصیت سے واقف تو تھے ہی ان کی خوبیوں سے بھی واقف کرایا۔ اطمینان دلایا کہ وہ کام کے اور باصلاحیت آدمی ہیں، آپ کے مقصد کے حصول میں معاون ثابت ہوں گے۔ استاذ محترم مولانا اصلاحی پورنیہ بہار سے چار طلبہ کے ساتھ اس بیابان میں خیمہ زن ہوگئے۔ ان مہمانان رسول کو گاؤں کے زندہ دل لوگوں نے اپنے ذمہ لے لیا۔ بلاتاخیر مولانا شبیر احمد اصلاحیؒ نے مدرسۃ الاصلاح کے نصاب کو نافذ کیا، اور طلبہ کے ساتھ تعلیمی وتربیتی سرگرمیوں میں مصروف ہوگئے۔ گردان بھی یاد کرارہے ہیں اور طلبہ کی تربیت بھی کررہے ہیں۔ بلریا گنج اور قرب وجوار کے طلبہ پر لازم قرار دیا کہ کھانا تناول کرکے رات مدرسے میں گزاریں۔ اسی طرح دارالاقامہ قائم ہوگیا۔ مفتی عبدالرؤف قاسمی پہلے سے موجود تھے، دینیات کے لیے کچھ وقت دیتے اور شاعری کرتے تھے۔ چند ماہ بعد مولانا اصلاحی

نے اپنے برادرِ خورد اقبال ندوی صاحب کو بھی بلا لیا۔ موصوف بڑی محنت، توجہ اور اخلاص سے عربی اول کی کتابیں پڑھانے لگے۔ ڈاکٹر خلیل صاحب مستقل توجہ دیتے رہے۔ ایک پاؤں مطب میں ہے تو دوسرا مدرسے میں۔ یہ ادارہ ان کے لیے راحتِ روح و جان بن گیا۔ ان کے نخلِ تمنا کو یہ اصلاحی، ندوی اور قاسمی سیراب کر رہے تھے۔ اس کی شادابی اور ہریالی نے ڈاکٹر خلیل کو ایک نئی حیات عطا کر دی۔ فرنگی لباس ترک کر دیا تھا۔ اب مدرسے والا لباس زیب تن کر رہے تھے۔ مطب میں اسی حال میں رہتے۔ صدر مدرس مولانا شبیر احمد اصلاحی کو کوئی مشورہ دینا ہے، لینا ہے، کسی موضوع پر بات کرنی ہے، مطب چھوڑ کر حاضر ہیں۔ کبھی تو مریضوں سے کہا، آپ لوگ صبر کریں میں ابھی آتا ہوں۔

اس گاؤں کے سارے لوگ مدرسے کو ترقی دینے کی جدوجہد میں شریک تھے۔ افسوس کہ آج وہ روح باقی نہیں رہی، لیکن ڈاکٹر صاحب ہر مرحلہ اور ہر موڑ پر کھڑے نظر آتے تھے۔ اس وقت کے سارے لوگ ان صفات کے حامل تھے۔ یہ آخری شمع تھی جو اَب خاموش ہے۔

آپ بڑے خوش مزاج زندہ دل انسان تھے۔ بہت خاکسار بھی تھے۔ متمول اور خوش حال گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ لیکن تعلّی اور تکبر کا شائبہ بھی ان کے اندر نہیں تھا۔ خدمت خلق کا جذبہ بھی بہت تھا۔ کسی کو کم تر اور حقیر نہیں سمجھا۔ عفان شاہ جو ابتدا سے مدرسے کے خادم تھے کبھی ان پر غصہ نہیں ہوئے۔ ان سے کوئی کام بگڑ گیا، غلطی ہوگئی تو ہنستے ہوئے بولتے، 'ارے یہ کیا کر دیا'، جبکہ اپنے فرزندوں کو ڈانٹ دیا کرتے تھے۔

مدرسہ قائم ہوگیا، مولانا اصلاحی نے اس کا نام 'جامعہ اسلامیہ' رکھا، اس کا ایک ترانہ بھی خود ہی لکھا، جسے طلبہ نے خوب پڑھا۔ ان دونوں حضرات نے اس گلشن علم و ایمان کو بنا سنوار دیا۔ مولوی ادریس تو ازل سے یہاں کا چراغ مرد درویش کی طرح جلاتے ہوئے آ ہی رہے تھے، لیکن مکتب کی حیثیت سے۔ مدرسے کا وجود انہی دو پاک روحوں کا مرہون منت ہے۔ اس گاڑی کے یہ دو پہیے تھے۔ دیگر حضرات ان دونوں کے بعد آئے۔

اس زمانے میں چترپور بہار میں ایک معیاری مدرسہ تھا، جماعت ہی کا، اس وقت کے امیر حلقہ اور دیگر ذمہ داروں نے بعد میں اسے ختم کر دیا۔ ڈاکٹر خلیل احمد صاحب نے وہاں سے مولانا جلیل احسن ندوی مرحوم کو بلریا گنج کے لیے مدعو کیا، وہ بہت سے طلبہ کے ساتھ اس زمین پر وارد ہوئے۔

ڈاکٹر صاحب عزت واحترام کے پھول ان پر برساتے رہے۔اب کوئی کام ان کے مشورے کے بغیر نہیں کرتے تھے۔ڈاکٹر صاحب ہمیشہ کھوج میں رہتے کہ کسی گاؤں میں کوئی استاذ مل جائے۔ریاضی وغیرہ کے ایک ریٹائرڈ ٹیچر ملے،ان کے قیام وطعام کا انتظام اپنے ذمہ لے لیا۔وہ تھے تو بہت قابل مگر ہم لوگوں کو پسند نہیں آئے۔ان سے ڈاکٹر صاحب نے معذرت کر لی۔

آپ جامعہ کے طلبہ واساتذہ کو دل وجان سے عزیز رکھتے تھے۔ایک حاجی صاحب نے قبرستان میں پیڑ پودے لگا رکھے تھے،طلبہ کبھی درختوں سے چھیڑ چھاڑ کر دیتے۔ایک دن مولانا جلیل احسن ندویؒ کے سامنے ایک طالب علم کو گالی دے دی۔آپ نے گاؤں کی پنچایت کی۔حاجی جی کی پیشی ہوئی۔اور قرارداد پاس ہوئی کہ آج سے قبرستان پر کوئی اختیار اور حق نہیں ہے آپ کا۔وہاں آپ صرف دوگز زمین کے مالک ہیں۔

گاؤں کا ایک نادان، چند سال قبل ثانوی شعبہ میں ہنگامہ کرنے لگا۔اس کا دعوی تھا میرا لڑکا فیل نہیں ہوا ہے،اس کو آگے ترقی دی جائے۔اس کے سامنے سب بے بس نظر آرہے تھے۔معاملہ کچھ ایسا ہی تھا۔راقم بھی وہاں موجود تھا۔ڈاکٹر صاحب اطلاع پاتے ہی کسی کے بلائے بغیر پہنچ گئے،اس کو سمجھانے کی کوشش کی۔وہ ضد پر اڑا رہا۔آخر میں آپ نے اس سے فرمایا،تمہارا بیٹا نہیں پڑھ سکتا،اس کو لے جاؤ،اور وہ خاموشی سے چلا گیا۔اب کوئی شخصیت ایسی نہیں رہ گئی جو اس طرح توجہ دے اور مدرسے کے مفاد میں اپنے ذوق وشوق سے کام لے۔

خاکساری کا نمونہ

جامعہ میں کبھی کبھی ثقافتی پروگرام خود اساتذہ کی نگرانی میں ہوتے تھے۔اسی کے ذریعے قرب وجوار میں جامعہ کا تعارف کرایا گیا، یہ ایک نہایت ہی موثر ذریعہ تھا۔اس علاقہ کے لیے مدرسہ ایک نئی شے تھی۔ایک اجتماع کی تیاری میں ہم طلبہ کافی مصروف تھے۔ساری رات کام کرتے رہے۔صبح میری طبیعت خراب ہوگئی۔مولانا شبیر احمد اصلاحی متحرک ہوئے۔احوال معلوم کیا اور خود ہی پیدل ڈاکٹر صاحب کے پاس پہنچ گئے۔ان کو کیفیت سے آگاہ کیا۔مولانا کسی بھی طالب علم کو رقعہ دے کر بھیج سکتے تھے،لیکن خود ہی گئے۔ڈاکٹر صاحب نے دوا مولانا کو نہیں دی۔خود ہی لے کر آئے،کھلائی، میں کچھ دیر میں ٹھیک ہوگیا۔یہ رویہ سب کے ساتھ ہوتا تھا۔ان دونوں شخصیات نے مل جل کر جامعہ کو آگے بڑھایا۔

دھوپ چھاؤں کی پروانہیں کی۔

ڈاکٹر صاحب اساتذہ کرام کا بہت احترام کرتے تھے، سب سے خندہ پیشانی کے ساتھ ملتے۔بعض حضرات کو ان کے انداز گفتگو سے یہ غلط فہمی ہو جاتی تھی کہ یہ صرف علوم جدیدہ پر زور دیتے ہیں اور اسلامیات کو ثانوی حیثیت دیتے ہیں۔مولانا شبیر احمد اصلاحی کو ان سے اس طرح کی کبھی کوئی شکایت نہیں ہوئی، نہ اس طرح کا ان سے کبھی کوئی تأثر ملا۔علماء کو لانے میں بھی تو آپ کا ہی نمایاں رول رہا۔ایک واقعہ کا ذکر یہاں مناسب ہوگا۔

1993 کی بات ہے، خاکسار نے مجلس تعلیمی کی ایک نشست رکھنے کی درخواست کی، اس میں کئی غیر ارکان مجلس کو بھی مدعو کیا گیا۔بعض نصابی امور و مسائل پر غور کیا گیا اور بعض فیصلے ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب نے بھی تبادلہ خیال کیا اور مجلس میں بھرپور حصہ لیا، علوم جدیدہ اور علوم اسلامیہ دونوں پر بحث کی۔اسی مجلس میں جمہرہ خطب العرب کو شامل نصاب کیا گیا تھا۔میٹنگ میں استاذ محترم مولانا محمد عنایت اللہ اسد سبحانی بھی شریک تھے۔اختتام پر باہر تشریف لائے تو مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بڑی حیرت سے فرمایا، میں تو بڑی غلط فہمی میں تھا۔ڈاکٹر صاحب کے بارے میں یہ تو بڑا غلط تأثر دیا جارہا ہے کہ وہ تو صرف علوم جدیدہ میں دلچسپی لیتے ہیں۔حالانکہ میٹنگ میں تو انہوں نے اسلامی علوم پر بہت زیادہ زور دیا۔میں نے جواب دیا کہ اسی لیے میں نے آپ حضرات کو میٹنگ میں شرکت کی زحمت دی تھی۔بات دراصل یہ ہے کہ علوم جدیدہ میں جس قدر مہارت پیدا کرنے کا وہ منصوبہ رکھتے تھے، اسی معیار پر علوم اسلامیہ کو بھی دیکھنا چاہتے تھے۔اگرچہ وہ عالم و فاضل نہیں تھے لیکن وہ چیزوں کا اندازہ خوب رکھتے تھے۔

مدارس میں علوم جدیدہ کے لیے مناسب اساتذہ نہیں مل سکتے، کیونکہ تنخواہوں کا معیار مدارس میں بہت کم ہے۔ہمارے مدرسے میں تو ایسے حضرات موجود ہیں جو عربی زبان اور دیگر علوم کو جو عربی زبان میں ہیں، معیار مطلوب کے مطابق نہیں پڑھا پارہے ہیں۔اساتذہ کی ایک تعداد ایسی بھی ہے جو خود کو معلم اور مربی سمجھنے کے بجائے ملازم سمجھتی ہے۔اسی وجہ سے ڈاکٹر صاحب کی باتوں کو لوگ سمجھ نہیں پاتے تھے اور الجھن کا شکار ہو جاتے تھے۔ظاہر سی بات ہے کہ علوم جدیدہ کو جب اتنا مقام دے رہے ہیں، ان کی تدریس کے معیار کو جب بلند کرنے کی بات کررہے ہیں، تو علوم دینیہ کی تدریس کو بھی اسی

معیار پر دیکھنا چاہیں گے۔اسی وجہ سے لوگ ان سے گھبراتے تھے۔انگریزی کا اگر کوئی باصلاحیت استاذ مل جائے، تدریسی اصول کے مطابق پڑھائی ہو، تو اس سے طلبہ کے اندر سمجھنے، لکھنے اور بولنے کی صلاحیت پیدا ہوجاتی ہے،لیکن عربی اساتذہ کو اس سے کیا تکلیف؟ یہی نہ کہ ان کے سامنے یہ سوالیہ نشان کھڑا ہوجائے گا کہ عربی والے اس طرح کیوں نہیں پڑھاتے ؟!

معمار شخصیت

آپ کے نزدیک محض مدرسہ چلانا اصل مقصد نہیں، ہمارے نصاب میں اور دستور میں لکھا ہوا تو بہت کچھ ہے۔افراد سازی اصل مقصد ہے۔ڈاکٹر صاحب فرمایا کرتے تھے کہ ہم یہاں ایسے افراد تیار کرنا چاہتے ہیں جو باطل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ یہ صرف دو ہی صورتوں میں ممکن ہے۔ ہمارے طلبہ شریعت کا وسیع اور گہرا علم رکھتے ہوں۔ یہ علم اسی وقت ممکن ہے جبکہ عربی زبان میں زبردست مہارت حاصل ہوجائے۔ وہ کوئی بھی کتاب پڑھ کر، سمجھ اور سمجھا سکتے ہوں۔موجودہ دور میں اسلام کی صحیح نمائندگی کر سکتے ہوں۔انگریزی زبان میں اتنی مہارت ہو کہ جدید علوم اور جدیدیت سے واقف ہوں۔

شوری کے اجلاس میں انتظامی امور ومسائل پر زیادہ بحث ہوتی ہے۔ یہ واحد رکن تھے جو انتظامیہ اور عاملہ میں تعلیمی معیار کا مسئلہ اٹھاتے تھے۔آخری ایام میں بہت کبیدہ خاطر تھے۔ جامعہ کو جس صورت میں دیکھنا چاہتے تھے وہ نظر نہیں آتا تھا۔ان کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکا تھا۔اتنی طویل مدت کے بعد بھی مطلوبہ معنوی ترقی نہیں ہوسکی تھی۔جس نے اپنے گھر کا کام کبھی نہ کیا ہوگا اس نے سردی کے شدید موسم میں ہاتھوں میں دستانے پہن کی جامعہ کے لیے اینٹیں اٹھائی تھیں، ظاہر ہے وہ اپنے خوابوں کو پورا ہوتے نہ دیکھ سکے ہوں گے تو کس قدر کبیدہ خاطر رہے ہوں گے اور کتنی حسرتوں کے ساتھ اس دنیا سے رخصت ہوئے ہوں گے۔

ڈاکٹر صاحب جامعہ کے موجودہ احوال وکوائف سے بہ خوبی واقف تھے۔ دل پر اس کا اثر لیتے تھے۔لیکن اس عمر میں کچھ کرنے کے قابل کب تھے۔قوی مضمحل اور جسم کمزور ہو چکا تھا۔ان کو یہی احساس تھا کہ اب میری سنتا کون ہے۔لیکن شوری کی نشستوں میں پھر بھی ضرور شریک رہتے تھے۔

بار بار یہ بات کہتے کہ مدرسہ پٹری سے اتر گیا ہے۔بلریا گنج جانا ہوتا تو ان کی زیارت کے

لیے ان کے دولت کدے پر سب سے پہلے حاضر ہوتا۔ میں صرف اکیلا ہی جاتا تھا۔ مجھ سے کئی بار کہا کہ آخرت میں آپ کو پکڑوں گا۔ ان کی اس بات کے پیچھے میری کوئی کوتاہی ضرور رہی ہوگی۔ ان کی نگاہ میں ایسا کوئی ناخوش گوار واقعہ ضرور پیش آیا ہوگا جس کا ان کی نگاہ میں سبب صرف میں ہوں۔ غلطیوں کا ارتکاب تو انسان کرتا ہی ہے، مجھ سے کسی خیر کی امید پر کوئی خطا ضرور ہوئی ہوگی۔

جس چمن کی ساری عمر آبیاری کرتے رہے وہاں وہ پھول نہیں کھل رہے ہیں جن کی ان کو اور ہم سب کو آرزو تھی اور اب بھی ہے۔ مرحوم اپنے کمرے میں بیٹھے ہوئے بھی جامعۃ الفلاح کے لیے سانس لیتے تھے۔ اسی کے تصور میں اٹھنا بیٹھنا سونا جاگنا سب کچھ ہوتا تھا۔ نظر انداز کیے جانے پر ان کو کوئی دکھ نہیں ہوتا تھا۔ وہ سب کچھ کر کے بھول چکے تھے، لیکن اللہ کے ریکارڈ میں تو سب کچھ درج ہے اور رہے گا۔ مولانا شبیر اصلاحی اور ڈاکٹر خلیل احمد کے نام آج مٹی میں روپوش ہیں، کبھی تیز بارش ہوگی تو وہ مٹی بہہ جائے گی اور ان دونوں کے نام بھی روشن ہوں گے اور خواب بھی زندہ ہوں گے، ان شاء اللہ۔

گالیاں کھا کے بدمزہ نہ ہوا!

حسن البنا ہوسٹل کی تعمیر کا آغاز کرنے کے لیے ایک جشن منایا جا رہا تھا۔ اسٹیج پر شیخ الجامعہ مولانا عمری مرحوم کے ساتھ خصوصی مہمانوں کی ایک اچھی خاصی تعداد تھی۔ باہر کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ اسٹیج پر کوئی رسم ادا کی جا رہی تھی۔ وی آئی پیز کو مومنٹو پیش کیے جا رہے تھے۔ لیکن افسوس ناک بات یہ تھی کہ وہاں موسسین کے نام کا کوئی ذکر تک نہ تھا۔ قمر الدین صاحب اس وقت حیات تھے، ڈاکٹر خلیل صاحب حیات تھے۔ میری نگاہوں نے تلاش کیا تو دیکھا کہ وہ پنڈال کے آخری حصے میں دھوپ میں ایک کرسی پر تشریف فرما ہیں۔ خاکسار ان کے پہلو میں جا کر بیٹھ گیا۔ آپ حسب طبیعت مسکرا رہے تھے۔ ذرہ برابر ان کے دل پر اثر نہیں کہ ان کو اسٹیج پر نہیں بلایا گیا۔ انہوں نے اس بات کو محسوس بھی نہیں کیا۔ یا اس کو لائق اعتنا بھی نہیں سمجھا۔ ان کو خوشی ہو رہی تھی کہ جدید ہوسٹل کی تعمیر شروع ہو رہی ہے۔ ان کے لیے یہی بات مسرت اور شادمانی کا باعث تھی۔ یہ تو ان کی وسعت ظرفی تھی کہ آخری کرسی پر جگہ ملی تو وہیں بیٹھ رہے، دوسرا کوئی ہوتا تو اس پروگرام میں شرکت بھی نہ کرتا۔ لیکن آپ نے ایک عام فرد کی حیثیت سے پروگرام میں شریک ہو کر اپنی عظمت کا ثبوت پیش کیا۔ بہر حال اس موقع پر جو رویہ اختیار کیا گیا اور جو ماحول تیار کیا گیا وہ جامعہ کے لیے خطرناک اور افسوسناک تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ کسی خصوصی

مہمان کو بھی لایا گیا تھا، جن سے یہ توقع تھی کہ ان کی دعاؤں سے یہ ہوسٹل جلد از جلد مکمل ہو جائے گا۔ اللہ کرے یہ منصوبہ جلد از جلد پایہ تکمیل کو پہنچ جائے۔

ڈاکٹر خلیل صاحب اپنے خلق عظیم کے ذریعہ یہ سبق چھوڑ گئے کہ کسی کی خدمات، خواہ وہ عفان شاہ ہی کی خدمات کیوں نہ ہوں، بھلانے کی کوشش کرنا شریف لوگوں کا شیوہ نہیں۔ دوسرا سبق یہ کہ کسی کے کارناموں کو اگر کوئی مجبوب کرے تو اس وجہ سے روٹھ کر بیٹھ نہیں جانا چاہیے۔ میرا عمل میرے اپنے ساتھ، تمہارا عمل تمہارے ساتھ، کہتے ہوئے اپنا سفر جاری رکھنا چاہیے۔ ڈاکٹر صاحب کو کئی مواقع پر ذہنی اذیت دینے کی کوشش کی گئی، لیکن انہوں نے اس کی پروانہ کی۔ زبان حال سے بہت کچھ کہا گیا، اور یہ معمولی لوگوں کی جانب سے ہوا، لیکن آپ یہ کہتے ہوئے گزر گئے:

ہیں کتنے شیریں تیرے لب اے رقیب
گالیاں سن کے بدمزہ نہ ہوا

جامعۃ الفلاح کے عظیم محسن

پروفیسر ملک حبیب اللہ فلاحی

اگر میں کہوں کہ بلریا گنج کے باشندگان سارے کے سارے کسی نہ کسی وقت میں جامعۃ الفلاح کے محسن رہ چکے ہیں تو اس میں کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔لیکن یہ بھی نہ بھولیں کہ جامعۃ الفلاح نے بھی اس گمنام بستی کو رونق بخشی اور اسے ملکی اور آفاقی شہرت دی۔

بلریا گنج کے محسنوں میں دو نام بہت ہی روشن ہیں،اس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا۔ پہلی شخصیت حکیم محمد ایوب رحمۃ اللہ علیہ کی ہے اور دوسری ڈاکٹر خلیل احمد رحمۃ اللہ علیہ کی ہے۔ جامعہ الفلاح میں میرے چار سالہ قیام کے دوران ان دونوں شخصیات نے مجھ سے انتہائی محبت کا برتاؤ کیا جو میرے دل پر نقش ہے اور ہمیشہ نقش رہے گا۔ یہاں تک کہ جب بھی ان کی یاد آتی ہے اور اکثر آتی ہے تو ان کے لیے میری زبان سے دعائے مغفرت نکل جاتی ہے۔اس بے پناہ شفقت اور محبت کی ایک ہی وجہ میری سمجھ میں آتی تھی کہ یہ دونوں میرے والد بزرگوار مولانا ملک حبیب اللہ قاسمیؒ کے دیرینہ تحریکی دوست تھے اور ان تینوں نے مولانا ابوبکر اصلاحی رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے بزرگان کے ساتھ مل کر جامعۃ الفلاح کی بنیاد رکھی تھی۔ یہ پودا جوان بزرگان نے لگایا تھا وہ آج ایک قد آور درخت بن چکا ہے۔

حکیم ایوب رحمۃ اللہ علیہ میرے ایک بزرگ جیسے تھے لیکن ڈاکٹر خلیل احمد رحمۃ اللہ علیہ میرے ایک بزرگ دوست تھے۔ جب میں جامعۃ الفلاح آیا تھا تو میں صرف پندرہ سال کا تھا لیکن میرے قیام کے چار سالوں میں وہ مجھے ایک ننھا دوست ہی گردانتے رہے۔ بڑی محبت اور بے تکلفی تھی ہمارے تعلقات میں۔ وہ اکثر مجھے اپنے مطب میں لے جاتے اور میرے ساتھ جامعۃ الفلاح کے بارے میں بہت سی باتیں کرتے تھے۔جامعۃ الفلاح کے لیے ان کے عظیم خواب تھے جن کو وہ شرمندۂ تعبیر کرنا چاہتے تھے۔ ہر بار جب میں ان سے ملتا تو وہ مجھ سے جامعۃ الفلاح کے حال اور مستقبل کے بارے

میں بات کرتے رہتے اور وہ ان پر میری رائے لینا چاہتے تھے اور مجھ سے مشورہ لیتے تو میں شرما جاتا کیوں کہ مجھے اپنی کم سنی اور کم مائیگی کا پورا احساس تھا۔ کبھی کبھی مجھے تنہائی میں ان کی باتیں اور ان کے جامعۃ الفلاح کے بارے میں بتائے ہوئے منصوبوں کا خیال آتا اور پھر مجھ سے رائے لینے کا خیال آتا تو میں سوچتا کہ کتنی قدر ہے میری ان کے دل میں۔ آیا وہ مجھے ایک ننھا ''دانش ور'' تو نہیں سمجھتے!

بسا اوقات وہ مجھ سے جامعہ کے احوال دریافت کرتے کہ ایک طالب علم کی حیثیت سے میں کیسے دیکھتا ہوں۔ بعض اوقات وہ مجھ سے پوچھتے کہ اگر جامعہ میں کوئی تکلیف ہے تو وہ اس کا ازالہ کر دیں۔ لیکن میں ہر سوال کے جواب میں یہی کہتا کہ اللہ کا شکر ہے اور کبھی کسی چیز کی شکایت نہیں کرتا۔ بعض اوقات مجھے ایسا لگا جیسے وہ دارالاقامہ میں کھانے وغیرہ کے بارے میں پوچھ رہے ہوں لیکن میں مسکرا کر کہتا کہ اللہ کا شکر ہے۔ میں اسلامی درس گاہوں میں کھانے کا عادی ہو چکا تھا۔ پانچ سال مدرسۃ الاصلاح سرائے میر میں اور دو سال جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ میں اور پھر چار سال جامعۃ الفلاح میں، سب جگہ کے کھانے تقریباً ایک جیسے تھے، البتہ میرے تجربے کی حد تک مدرسۃ الاصلاح کا کھانا ان تینوں درس گاہوں میں سب سے اچھا تھا۔ ہمارے قیام کا مقصد کھانا نہیں تھا بلکہ حصولِ علم تھا اس لیے کسی شکایت کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔

ڈاکٹر خلیل احمد رحمۃ اللہ علیہ ہم سے رخصت ہو گئے ہیں لیکن جامعۃ الفلاح کے لیے ان کی عظیم خدمات ایک بڑے صدقہ جاریہ کے طور پر تا قیامت ان کے لیے ایصالِ ثواب کا ذریعہ رہیں گی اور ان کی یہی خدمات جلیلہ ان کو اور ان کے عظیم رفقاء جنھوں نے مل کر جامعۃ الفلاح کی تاسیس کی تھی ان شاء اللہ ان کے جنت الفردوس میں داخلے کا سبب بنیں گی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: **فَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْراً يَرَهُ** یہ اللہ کا وعدہ ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے وعدوں کے خلاف نہیں جاتا۔ **إِنَّ اللّهَ لاَ يُخْلِفُ الْمِيْعَاد.**

میں اپنے آپ کو بہت خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ اتنے لمبے عرصے کے بعد میں نے دسمبر ۲۰۲۲ء میں جامعۃ الفلاح کی زیارت کی اور ڈاکٹر خلیل احمد رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ ان کو دیکھ کر ساری پرانی یادیں تازہ ہو گئیں۔ اور میں نے اپنے ذہن میں یہ پروگرام بنا لیا تھا کہ ان شاء اللہ العزیز اگلے سال دسمبر میں پھر حاضری دوں گا اور اپنے بزرگ دوست کے ساتھ بیٹھ کر

جامعۃ الفلاح یعنی اپنی مادرِ علمی کے بارے میں ڈھیروں باتیں کروں گا۔لیکن اللہ کو کچھ اور ہی منظور تھا، چنانچہ وہ ہم سے جدا ہو گئے۔

یـــریـــد الـــمـــرء أن یـــعـــطـــی مـــنـــاه

ویـــأبـــی الـــلـــه الا مـــا یشـــاء

ڈاکٹر صاحب! آپ سے میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کے پیارے جامعۃ الفلاح اور اپنی مادرِ علمی کو میں تنہا نہیں چھوڑوں گا اور جب تک زندہ ہوں اس کی ترقی اور بہبودی کے لیے جان توڑ کوشش کرتا رہوں گا۔ باذن اللہ!

ہم چلے جائیں گے ترے شہر کی گلیوں سے دور

ایس عبداللہ

زندگی جسم، روح اور وقت کے مجموعے کا نام ہے اور موت انھیں اجزاء کا انتشار ہے۔ دنیا کے تمام جانداروں کو اسی ترتیب اور انتشار سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ دوسرے تمام جاندار فطری طور پر پیدا ہوتے اور مرتے رہتے ہیں۔ خالق کائنات نے انھیں عمل کا پابند نہیں بنایا ہے مگر انسان کو اس نے عمل کا پابند بنایا ہے اور اسی کے ذریعے دنیا کے بقیہ انسان اسے یاد کرتے اور بھولتے رہتے ہیں۔ اپنے اعمال و رویہ کے ذریعے کچھ انسان اتنے اہم ہو جاتے ہیں کہ انھیں بھولنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ ان ہی انسانوں میں سے ڈاکٹر خلیل احمد صاحب بھی ایک تھے۔

مرحوم ڈاکٹر خلیل احمد صاحب سے میری آخری ملاقات ایک شادی کی تقریب میں تقریباً دو تین ماہ پہلے اعظم گڑھ میں ہوئی تھی۔ شادی میں شریک ہونے کا میرا واحد مقصد اپنوں سے ملاقات کا تھا ورنہ جسمانی طور پر میں خود اس قابل نہیں تھا کہ شادی بیاہ کی مجلسوں میں شریک ہوسکوں۔ شادی کے شامیانے میں داخل ہوتے ہی میں نے ڈاکٹر صاحب کو دیکھ لیا۔ دل خوش ہوگیا۔ میں لپک کر ان کے پاس گیا۔ خلافِ توقع ڈاکٹر صاحب صحت مند نظر آئے۔ انھوں نے اپنے پاس کی ایک کرسی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ بیٹھ جاؤ۔ وہ کرسی انھوں نے اپنے پوتے یا نواسے سے میرے لیے خالی کروائی تھی۔ میں نے ان کے چہرہ پر خوشی کی چمک اور انسیت بھری مسکراہٹ دیکھی اور بے ساختہ ان سے بغل گیر ہوگیا۔ کچھ دیر تک ان کے پاس بیٹھا رہا۔ انھوں نے قدرے تفصیلی خیریت دریافت کی اور میں انہیں بتاتا رہا۔ اس دن مجھے انتہائی احساس ہوا کہ ڈاکٹر صاحب بہت زیادہ پرتپاک انسان ہیں اور یہ آخری ملاقات نقشِ دل بن گئی۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ تپاک کچھ میرے لیے ہی خاص نہیں تھا۔ مرحوم ہر جاننے والے سے اسی تپاک کے ساتھ ملتے تھے۔ میرے اور ڈاکٹر مرحوم کے تعلقات نصف صدی سے

زیادہ عرصے کے تھے۔

خوشی مزاجی ڈاکٹر صاحب مرحوم کی فطرت میں تھی۔ایک دن مرحوم کلیہ البنات، بلریا گنج کی آفس میں بیٹھے ہوئے تھے۔ میں بھی وہاں پہونچ گیا۔ مجھے دیکھتے ہی انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا ''تو پیر صاحب بھی آ گئے'' مرحوم سے میری ملاقات مہینوں کے بعد ہوئی تھی۔ میں ان کے پاس گیا ان سے مصافحہ کیا اوران کے ہاتھوں کا بوسہ لے لیا۔مرحوم کھل کھلا کر ہنسنے لگے اور کہنے لگے اتنا تازہ بدلہ! لوگ کہتے ہیں کہ کسی کے چہرے پر مسکراہٹ بکھیر دینا کارثواب ہے۔اگر یہ بات درست ہے تو ڈاکٹر صاحب مرحوم کے پاس اس طرح کے ثواب کا ذخیرہ رہا ہوگا جسے لے کر وہ چلے گئے، کاش ان کا یہ خوشگوار عمل کچھ اور مسکراہٹیں فراہم کرتا رہتا۔

کئی سال پہلے خاکسار کو مرحوم کی قیادت میں دہلی کا سفر کرنے اور دو یا تین دن ان کے ساتھ قیام کرنے کا موقع ملا۔ ہوا یوں کہ جامعہ ہمدرد دہلی میں ایک پروگرام تھا جس میں ڈاکٹر صاحب مرحوم کو اور مجھے جامعۃ الفلاح کی نمائندگی کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا۔سفر کا آغاز بلریا گنج سے ہی ہوا تھا۔ڈاکٹر صاحب مرحوم کے پاس ایک چھوٹا سا اور ہلکا سا بیگ تھا۔میرے پاس بھی مختصر سامان کے ساتھ ویسا ہی چھوٹا سا بیگ تھا۔بلریا گنج میں ایک عام سواری والی جیپ رکوائی گئی۔ جیپ پر بیٹھنا تھا چنانچہ میں نے چاہا کہ ڈاکٹر صاحب مرحوم کا بیگ ان سے لے لوں تا کہ وہ آسانی کے ساتھ جیپ پر بیٹھ جائیں مگر انہوں نے اپنا بیگ مجھے نہیں لینے دیا اور مسکرا کر کہا کہ ''مال عرب پیش حرب''۔

سفر کا مقصد تو مرحوم کی شخصیت کو جاننا بالکل نہیں تھا بلکہ کچھ اور تھا مگر ثانوی طور پر سفر اور قیام کے دوران دانشوروں کی کسوٹی کے ذریعہ ڈاکٹر صاحب مرحوم کی شخصیت کے بارے میں یہ احساس ہوا کہ یہ سونا توقع سے زیادہ خالص ہے اور اس سفر و قیام کے بعد میری نگاہ میں مرحوم کی شخصیت بلند سے بلند تر ہوگئی۔

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

سالوں پہلے کی بات ہے، میں کسی کام سے کلکتہ گیا ہوا تھا۔ایک ضرورت کے تحت کالج اسٹریٹ جانا ہوا۔ وہاں نئی اور پرانی کتابوں کی کئی دکانیں تھیں۔میں نے اپنے ذوق اور استطاعت کے مطابق پرانی کتابوں کے انبار میں سے کچھ کتابیں خریدیں۔ان میں ایک کتاب جو ہومیو پیتھ پر تھی

جس کو میں نے ڈاکٹر صاحب کو ہدیہ کرنے کے ارادہ سے خریدا تھا۔کلکتہ سے واپسی کے بعد میں نے وہ کتاب مرحوم کی خدمت میں پیش کی جس کو انہوں نے بہت خوشی کے ساتھ قبول کیا۔مرحوم کتابوں کے شائق تھے۔ان کے مطابق کتابوں پر خرچ کیے ہوئے پیسے بہت نفع آور ہوتے ہیں۔

ایک بار جامعۃ الفلاح سے متعلق کسی کام سے مرحوم کو سیدھاری - اعظم گڑھ میں رکنا پڑا۔ کام پریشان کن تھا۔ میں بھی ان کے ساتھ تھا۔کام اگر چہ پریشان کن تھا مگر ان کے چہرے پر اطمینان تھا وہ کسی بھی طور پر پریشان نہیں تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ مرحوم بہت زیادہ باہمت اور بلند حوصلہ ہیں۔ اس دوران وہ اپنے معمولات کی پابندی بھی کرتے رہے۔ پریشان کن حالات میں بھی ان کی استقامت قابل رشک تھی۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم انتہائی نیک دل اور نرم مزاج انسان تھے۔ میں بلریا گنج میں قیام کے دوران ایک ایسے مکان میں رہ رہا تھا جس میں مکان ہونے کی کوئی خصوصیت نہیں تھی۔انتہا یہ تھی کہ بارش کے دنوں میں چار پائی پر ایک کنارے بیٹھ کر رات گزارنی پڑتی تھی۔مرحوم کو جب اس صورت حال کا پتہ چلا تو انہوں نے مجھے اصرار کر کے اپنے ایک مکان میں منتقل کروایا۔سڑک کے کنارے کشادہ اور بھرپور مکان تھا۔ان دنوں بلریا گنج میں باہر سے آنے والوں کے لیے مکان کی بہت قلت تھی۔ میں اس مکان میں بہت دنوں تک رہا۔سب سے اہم بات یہ ہے پیش کش کے باوجود انھوں نے کرایہ کے طور پر ایک پائی بھی قبول نہیں کی۔انسان دوستی کی یہ خوبی ڈاکٹر صاحب میں بدرجہ اتم موجود تھی۔

مرحوم جامعۃ الفلاح کی مجلس شوری کے مستقل ممبر تھے۔مجلس شوری کے لوگ بھی ان کی دانائی اور قوت فیصلہ کے قائل رہے۔کبھی کبھی مجلس عاملہ میں مجھے بھی شریک ہونے کا موقع ملا کرتا۔اس مجلس میں بھی ان کی دوراندیشی اور مدلل باتوں سے لوگ متأثر تھے۔

مرحوم شبلی نیشنل کالج کی انتظامیہ کا بھی حصہ تھے وہاں بھی ان کے خاصے اثرات تھے۔بلریا گنج میں یتیم خانہ کے وہ روح رواں تھے۔یتیم خانہ میں جانے کے بعد ان کا حسن انتظام اور سرپرستی نمایاں نظر آتی تھی۔دیگر اداروں نے بھی ان سے یقیناً فیض حاصل کیا ہوگا۔

مرحوم علم دوست،علما اور علم دانوں کے قدردان بھی تھے۔خود ان کا علم بھی کچھ کم نہ تھا۔وہ مسلم طلبا کی علمی اور معاشی ترقی کی تدبیریں سوچتے رہتے تھے۔جن کا اظہار ان کے عمل کے ذریعے اور

مجلسوں میں ان کے خیالات کے ذریعے ہوتا رہتا تھا۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم میں بے شمار خوبیاں تھی۔ ان کا فسانہ طویل ہے۔ کسی ایک قلم کے ذریعے ان کی خوبیوں کا احاطہ کرنا دشوار عمل ہے۔ ان کے نہ رہنے کے بعد اب ذہن میں بنے ان کی یادوں کے نقوش ابھرتے رہیں گے اور ان کا تذکرہ ہوتا رہے گا مگر افسوس کہ

کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

میرے مربی میرے محسن

مولانا محمد عمران فلاحی

قصبہ بلریا گنج جو اَب نگر پالیکا ہوگیا ہے اعظم گڑھ کے شمال میں تقریباً ۱۷رکلومیٹر پر واقع ہے۔اس کو شروع میں موضع خیرالدین پور جو بلریا گنج کے جنوب میں تقریباً دس کلومیٹر پر واقع ہے، کے چند خاندان نے آکر بسایا اور آباد کیا تھا۔جن میں راقم کا خاندان جو بکھریا گھرانے کے نام سے جانا جاتا ہے اور مرحوم ڈاکٹر خلیل احمد صاحبؒ کا خاندان جو قاضی گھرانے کے نام سے جانا جاتا ہے نیز چند دیگر گھرانوں نے سب سے پہلے آکر اسے بسایا، پھر لوگ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا، آبادی بڑھتی گئی اور اب یہ شہر کی شکل اختیار کرنے جا رہا ہے۔بلریا گنج کا محل وقوع مختلف جہتوں سے بہت ہی اہمیت کا حامل ہے اور اس کو مختلف پہلوؤں سے مرکزیت حاصل ہے۔اس کے چاروں طرف برادرانِ ملت کی اچھی خاصی بستیاں پائی جاتی ہیں۔اس بنا پر بلریا گنج ایک محفوظ اور پرامن علاقہ سمجھا جاتا ہے۔بلریا گنج کے قدیم باشندے فطرتاً صلح پسند اور شریف النفس ہیں۔گروہی و مسلکی تشدد سے پاک ہیں، اس لیے یہاں کا ماحول اتنا پرسکون ہے کہ یہاں کے ہندو مسلم سب ایک دوسرے کے ساتھ خوشگوار ماحول میں رہ رہے ہیں۔جناب ڈاکٹر خلیل احمد صاحبؒ نے اسی بلریا گنج کے زمیندار قاضی گھرانے میں تقریباً آج سے ۹۰ سال پہلے آنکھیں کھولیں۔موصوف مرحوم اپنے والدین کے اکلوتے فرزند اور اپنے خاندان کی نصف جائیداد کے مالک تھے۔آپ نے پس ماندگان میں چار لڑکے اور تین لڑکیاں یعنی کل سات اولاد چھوڑی ہیں۔آپ کا سانحہ ارتحال جامعہ کے لیے بہت بڑا خسارہ ہے، اللہ تعالیٰ آپ کی خدمات کو قبول فرمائے۔

آپ کی شخصیت اہل علم خصوصاً جامعۃ الفلاح سے متعلق افراد کے لیے محتاج تعارف نہیں ہے۔آپ جب علی گڑھ سے طب کی تعلیم مکمل کر کے بلریا گنج تشریف لائے تو ابتدا میں بہت ہی شاہانہ زندگی گزاری، مریضوں کو دیکھنے کے لیے ایک گھوڑا پال رکھا تھا اس پر سوار ہو کر مریضوں کو دیکھنے و علاج کرنے کے لیے ان کے گھروں پر جاتے۔سائیکل یا موٹر سائیکل کا استعمال نہیں کرتے۔مگر دھیرے

دھیرے طبیعت میں سادگی آتی گئی اور آپ کی زندگی میں اس وقت عظیم انقلاب برپا ہوا جب آپ جماعت اسلامی ہند سے باقاعدہ وابستہ ہوگئے اور آپ نے جسمانی علاج کے ساتھ روحانی علاج کا بھی بیڑا اٹھالیا اور دعوت وتبلیغ میں یکسو ہوکر لگ گئے۔ روزانہ کا معمول بنالیا کہ فجر کی نماز باجماعت عام طور پر پچھم محلّہ جامع مسجد میں ادا کرتے اور نماز کے بعد ایک حدیث شریف اور اس کا ترجمہ سناتے، اس کے بعد کسی رفیق یا عزیز سے ملنے چلے جاتے۔ ڈاکٹر صاحب اپنی صحت کا خیال رکھتے، روزانہ پابندی سے ورزش کرتے، وقتاً فوقتاً ورزش کے لیے ہم لوگوں کو بھی ترغیب دیتے اور عملی طور پر اس کا طریقہ بتا کر اس کے فوائد بھی بیان کرتے تھے۔

آپ نے اپنے بچوں کی تربیت پر خصوصی توجہ دی۔ ماشاءاللہ آپ کے سبھی بچے مطیع وفرمانبردار رہے۔ اس کی جہاں اور وجوہات ہوسکتی ہیں، وہیں خاص وجہ یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے بھی اپنے والد کی خوب خدمت کی اور ان کے مطیع وفرمانبردار رہے۔ جب بچوں نے اپنی آنکھوں سے ڈاکٹر صاحب کا عمل دیکھا تو اس سے آپ کی اولاد بھی متأثر ہوئی اور ہمیشہ فرمانبرداری کا مظاہرہ کرتی رہی۔

تربیت کی غرض سے ایک مرتبہ ڈاکٹر صاحب نے مجھے مخاطب کرکے فرمایا کہ ''میرے والد کے بڑھاپے میں مرض کے چلتے لنگی خراب ہوگئی تھی، مجھے دیکھ کر والد صاحب کی آنکھوں میں آنسو آگئے چونکہ میری والدہ کا پہلے انتقال ہوچکا تھا اس لیے والد صاحب کی خدمت کی ذمہ داری مجھ پر تھی۔ میں نے کہا ابو جان آپ کیوں رو رہے ہیں؟ میں آپ کی ہر طرح کی خدمت کے لیے تیار ہوں، میرا یہ رویہ دیکھ کر والد صاحب کو اطمینان ہوا، میں نے فوراً ان کو نہلایا اور کپڑا تبدیل کروایا''۔ ڈاکٹر صاحب کا اس واقعہ کو بیان کرکے اپنی کارکردگی کا اشتہار مقصود نہیں تھا بلکہ دوسروں کی تربیت کرنا تھا اور یہی آپ کا اندازِ تربیت بھی تھا۔

ڈاکٹر صاحب کو انگریزی زبان پر تو عبور تھا ہی، ان کو عربی سیکھنے کا بھی بہت شوق تھا تاکہ قرآن وحدیث کو براہ راست سمجھ سکیں۔ اس کام کے لیے آپ نے راقم کو حکم دیا، اس حکم کی تعمیل میں میں نے کوئی تاخیر نہیں کی، بلکہ اس کو اپنے لیے اعزاز سمجھا اور روزانہ بعد نماز مغرب پابندی سے ان کے مطب پر جاتا اور اسباق النحو اول اور اسباق النحو دوم کا درس دیتا اور یہ سلسلہ چلتا رہا۔ جب ڈاکٹر صاحب کی مقبولیت بڑھ گئی اور جامعہ کے لیے زیادہ وقت دینے لگے تو اس کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔

ڈاکٹر صاحب کے قول وعمل میں تضاد نہیں تھا، آپ نے جس طرح اپنی زندگی شریعت کے

مطابق گزارنے کی بھرپور کوشش کی وہیں آپ نے اپنی اولاد کے لیے بھی یہی پیغام دیا۔ اپنے ترکے سے متعلق وصیت کردی تھی کہ میرا ترکہ شریعت کے اصول کے تحت تمام حق داروں میں تقسیم کیا جائے۔ سہولت کی خاطر آپ نے اس کو تحریری شکل دے کر دو گواہوں سے دستخط بھی کرالیا تھا۔

جب راقم کو انجمن طلبۂ قدیم کے ذمہ داروں نے انجمن کا سکریٹری منتخب کیا تو اس کے دوسرے ہی دن ڈاکٹر صاحب نے مجھے حکم دیا کہ تم کو میرے ساتھ جامعہ کے محسنین سے ملاقات کے لیے سفر پر چلنا ہے، حکم کی تعمیل کرتے ہوئے چند ایام ان کے ساتھ سفر پر رہا، اس سفر کے دوران ڈاکٹر صاحب کو اور قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، عام طور پر کسی شخص کی اصلی پہچان سفر ہی میں ہوتی ہے۔ میں نے آپ کو بہت ایمان دار، کم خرچ کرنے والا، ایک دوسرے کی خواہشات کا احترام کرنے والا اور بہت ہی خاکسار پایا۔ آپ نے جامعہ کے مال کو اپنا مال نہیں سمجھا بلکہ اس کو مال یتیم سمجھ کر بہت ہی احتیاط سے خرچ کیا، ایک روپیہ بھی اپنی ذات پر خرچ نہیں کیا، اور نہ ہی کبھی تنخواہ کا مطالبہ کیا۔ یہی وجہ ہے کہ کئی بار نظامت کی ذمہ داری کا بار اٹھانے کے باوجود آپ پر کسی نے بدعنوانی کا الزام نہیں لگایا۔ جبکہ عام طور پر لوگ ذمہ داروں کی ٹوہ میں لگے رہتے ہیں کہ کہیں سے کوئی کمزوری مل جائے تو بدنام کریں۔

جامعۃ الفلاح کی تعمیر وترقی میں ایک اہم رول ادا کرنے والی ہر دل عزیز شخصیت جناب حاجی محمد اکرام پردھان کی ہے، جن کے نام پر بلریا گنج نگر پالیکا کے ایک وارڈ کا نام ''اکرام نگر'' رکھا گیا ہے۔ ان کی نظامت کی ذمہ داری سن ۱۹۶۰-۱۹۶۳ء رہی۔ آپ کے زمانۂ نظامت میں جامعۃ الفلاح نے چوطرفہ ترقی کی۔ مودودی ہاسٹل کی تحتانی منزل جو ایک ہال اور اس کے شمال اور جنوب میں دو بڑے کمرے، پھر ہال میں دائیں اور بائیں ایک ایک چھوٹے کمرے حاجی اکرام پردھانؒ کی نظامت میں تعمیر کیے گئے۔ پردھان نے اندرون ملک اور بیرون ملک اس کی مالیات کے لیے سفر کیا اور اس کی تعمیر کا پورا خرچ محسنین سے حاصل کیا۔ حاجی اکرامؒ پردھان راقم کے خاندان (بکھریا) کے چشم وچراغ تھے۔ یہ بھی ڈاکٹر صاحب کی طرح اکلوتے سپوت تھے۔ ہمارے خاندان کی نصف جائیداد کے مالک وحق دار تھے، چوں کہ ہمارے والد مرحوم محمد کاملؒ سے عمر میں بڑے تھے اس لیے ہم لوگ بڑے ابو کہنے کے بجائے بابا کہہ کر پکارتے۔ ان کی جو ٹیم تھی اس میں بھی ڈاکٹر خلیل احمد صاحب شامل تھے۔ یہ ٹیم تین افراد پر مشتمل تھی۔ (۱) اس وقت کے ناظم اکرامؒ پردھان جنھوں نے اپنے ذمہ تعمیرات کے وسائل مع

مالیات کی فراہمی کے شامل رکھا تھا۔ (۲) جناب ڈاکٹر خلیل احمدؒ ان کے ذمہ تعلیمی امور تھے۔ (۳) جناب منشی فوجدار احمدؒ ان کے ذمہ جامعہ کے کاغذات نیز خریداری وغیرہ تھی۔ اکرام پردھان ضرورت پڑنے پر خود لوہے کی سریا و دیگر سامان کندھوں پر رکھ کر لاتے تھے، میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ اگر مستری کو اینٹ وغیرہ کی کمی پڑتی تو مزدور کے ساتھ اس کو بھی اٹھا کر دینے لگتے تھے، یہ تھا سابقین کا خلوص۔

اہل بلریا گنج کے مخلص وفعال اور دیندار افراد نے بہت پہلے ہی اس جامعہ کے مکتب کو ایک ایسی عربی درس گاہ بنانے کا عزم کرلیا تھا جو جدید وقدیم علوم کا سنگم ہو۔ اس مشن اور وژن کو آگے بڑھانے میں ڈاکٹر خلیل احمد صاحب کا بڑا کردار رہا ہے۔ آپ نے دیگر امور کے ساتھ ساتھ جامعہ کے تعلیمی اوقات کی تقسیم اس طرح کردی تھی کہ قدیم مضامین کے لیے روزانہ چھ گھنٹیاں اور جدید مضامین کے لیے دو گھنٹیاں مختص کردی گئی تھیں، اس طریقہ کو جامعہ نے آج بھی برقرار رکھا ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ جامعۃ الفلاح کے فارغین جہاں دیگر فنون میں مہارت رکھتے ہیں وہیں چار زبانوں (عربی، اردو، انگریزی اور ہندی) میں بھی لکھنے، پڑھنے، بولنے اور سمجھنے پر قادر ہوجاتے ہیں۔ اور ساتھ ہی ساتھ ایک پانچویں زبان فارسی سے بھی ابتدائی واقفیت ہوجاتی ہے۔ جامعۃ الفلاح کے فارغین ایک طرف قرآن وسنت کا گہرا علم، دین کی بصیرت اور اسلامی اخلاق وکردار کے حامل ہوتے ہیں تو دوسری طرف ان کی نظر وقت کے اہم مسائل پر بھی ہوتی ہے۔

ڈاکٹر خلیل احمد صاحبؒ نے مکتب اسلامیہ کو جامعہ اسلامیہ سے جامعۃ الفلاح بنانے کے لیے انتھک کوشش کی، اپنے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرتے ہوئے اس ادارے کو واقعتاً جدید وقدیم کا سنگم بنادیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے اور دیگر لوگوں سے سنا بھی ہے کہ جب تعلیمی کارواں نے جناب سید حامدؒ (سابق وائس چانسلر، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) کے ساتھ ملک کے طول وعرض کا دورہ کیا تو جب کسی مدرسے میں جدید مضامین کو داخل کرنے کے لیے کہا جاتا تو آپ سے یہ سوال کیا جاتا کہ یہ کیسے ممکن ہے، اس کے جواب میں سید حامدؒ صاحب فرماتے کہ جس کو جدید وقدیم کی تعلیم کا سنگم دیکھنا ہو اسے جامعۃ الفلاح کو دیکھنا چاہیے۔

مولانا عبدالحسیب اصلاحی صاحبؒ کی وہ گفتگو آج بھی مجھ کو یاد ہے، آپ کلاس میں مختلف مواقع پر ہم طلبہ سے فرمایا کرتے تھے کہ جب میں سن ۱۹۶۲ء میں چند ماہ جامعۃ الفلاح میں تدریس کی

خدمت انجام دینے کے بعد ایفائے عہد کے مطابق جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ چلا گیا اور تدریس کی ذمہ داری سنبھالی تو ڈاکٹر خلیل احمد صاحبؒ، حکیم محمد ایوبؒ کو لے کر تقریباً ہر جمعہ کو صبح سویرے علاؤالدین پٹی میرے گھر تشریف لاتے اور جامعۃ الفلاح آنے کے لیے اصرار کرتے مگر چوں کہ میں جامعۃ الرشاد میں تدریس کی ذمہ داری انجام دے رہا تھا اس لیے وہاں سے چھوڑ کر آنا ممکن نہیں تھا۔ میں برابر معذرت کرتا رہا، مگر ان حضرات نے میرے چچا جان سے درخواست کی تو انھوں نے مجھ سے کہا کہ یہ لوگ بار بار آرہے ہیں تم ان کی بات مان کیوں نہیں لیتے، یہ جگہ گھر سے قریب ہے اور تم کو آنے جانے میں آسانی ہوگی۔ میں چچا جان کی بات کا انکار نہیں کرسکا، بالآخر ڈاکٹر خلیل احمد صاحب کی کوشش رنگ لائی اور میں ۱۹۶۴ء میں دوبارہ جامعۃ الفلاح آ گیا۔ میرے آنے کے بعد ڈاکٹر خلیل احمد صاحب کو حوصلہ ملا۔ آپ اور دیگر ذمہ داروں نے اب باقاعدہ عربی درس گاہ عملاً کھولنے کا فیصلہ کرلیا اور ۱۹۶۴ء میں عربی کے چار درجات کھول دیے گئے۔ چوں کہ راقم نے جناب مولانا عبدالحسیبؒ اصلاحی سے ۱۹۶۲ء میں عربی نحو وصرف کی ابتدائی تعلیم سیکھ لی تھی پھر جناب مولانا شبیر احمد اصلاحیؒ سے اس کی تکمیل کرلی تھی اس لیے ۱۹۶۴ء میں میرا داخلہ عربی دوم میں سب سے پہلے لے لیا گیا، عربی داخل خارج رجسٹر میں میرا داخلہ نمبر پہلا (اول) ہے۔ اہل بلریا گنج اور قرب وجوار کا خلوص تھا کہ بیک وقت چار درجات کے اساتذہ وبورڈر طلبہ کے قیام وطعام کے اخراجات کے بوجھ کو برداشت کرلیا گیا، ورنہ یہ مدرسہ دیوالیہ ہوگیا ہوتا۔ ڈاکٹر خلیل احمدؒ اور مولانا عبدالحسیب اصلاحیؒ نے مل کر اساتذہ فراہم کیے۔ زمین رسول پور سے جناب مولانا صغیر احسن اصلاحیؒ پھر بعد میں مولانا جلیل احسن ندویؒ، مولانا شہباز اصلاحیؒ، مولانا محمد عنایت اللہ سبحانی صاحب اور دیگر علمائے کرام وماسٹر حضرات کی ایک ٹیم تیار کی جو باصلاحیت افراد پر مشتمل تھی، یہ ٹیم اہل علم اور تحریک کے افراد کے لیے محتاج تعارف نہیں ہے۔

یہ حضرات خلوص کے ساتھ طلبہ وطالبات کی تعلیم وتربیت میں لگ گئے اور جامعہ ترقی کی منازل طے کرنے لگا۔ اور ہر سال مزید ایک درجے کا اضافہ ہوتا رہا اور فضیلت کی تعلیم مکمل کرکے ہر سال طلبہ فارغ ہونے لگے۔ ۱۹۶۷ء میں پہلا بیچ فارغ ہوا اور ان سبھی فارغین کا داخلہ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں ہوگیا۔ یہ حضرات اپنی تعلیم مکمل کرکے دین کی خدمت میں لگ گئے۔

ڈاکٹر صاحب مالیات کے سلسلے میں بہت حساس اور محتاط رویہ اختیار کرتے تھے۔ آپ نے

جامعہ کی نظامت کے زمانے میں مالیات کے متعلق ایک سہ نفری کمیٹی بنا رکھی تھی، جو ناظم جامعہ ڈاکٹر خلیل احمدؒ صاحب، خازن جامعہ جناب شیخ منیر احمدؒ صاحب وممبر شوری سیٹھ عبدالمتینؒ صاحب پر مشتمل تھی۔ جب جامعہ کی رقم بینک میں جمع کرنا ممکن نہیں ہوتا تو وہ رقم ان تینوں افراد کے پاس بطور امانت رکھ دی جاتی اور اس کمیٹی کے تمام ممبران کو یہ پتہ رہتا کہ مدرسے کی رقم کس کے پاس کتنی بطور امانت ہے تاکہ اگر کسی کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آجائے تو دوسرا بتا سکے کہ ان کے پاس اتنی رقم بطور امانت رکھی ہوئی تھی، یہ تھی احتیاطی تدبیر جس کو ڈاکٹر صاحب اپنائے ہوئے تھے۔

ڈاکٹر خلیل احمد صاحبؒ نے نہ صرف جامعۃ الفلاح کی نظامت کی ذمہ داری بحسن وخوبی ادا کی بلکہ آپ نے اس کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا تھا۔ آپ چھوٹے بچوں کے خاص طور پر بہترین معالج تھے، اس میں آپ کو بہت شہرت حاصل تھی۔ آپ کے مطب کے باہر مریضوں کی لائن لگی رہتی تھی، مگر جامعہ کے امور کی مشغولیت کی وجہ سے مطب کی ذمہ داری اپنے صاحبزادے ڈاکٹر انیس الرحمٰن کے حوالے کر کے خود کو جامعہ اور جماعت کے لیے یکسو کر لیا تھا۔ آپ نے جامعۃ الفلاح کو اپنی نظامت کے زمانے میں ایک قیمتی زمین (جو اس وقت شعبۂ حفظ میں ہے) کو جامعہ کے لیے وقف کر دیا تھا۔ اور عمر کے آخری حصے میں شعبۂ نسواں سے متصل ان کا جو ایک باغ تھا جس کے نصف حصے کے آپ مالک تھے اس کو بھی جامعہ کے لیے وقف کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ جماعت اسلامی ہند کی خواہش پر ایک زمین برائے یتیم خانہ بھی وقف کی تھی۔ ساتھ ہی اس کی ایک منزل اپنے عزیز واقارب سے تعاون حاصل کر کے تعمیر کروادی تھی اور یتیم بچوں کی سہولت کے لیے اسی احاطے میں ایک منزلہ مسجد بھی بنوادی تھی، پھر بعد میں جماعت نے یتیم خانہ اور مسجد کی تکمیل کی۔ یہ یتیم خانہ بلریا گنج میں گلشن اطفال کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اسی طرح آپ نے اپنی چک میں گاؤں کے پچھم جانب بھی ایک مسجد بطور صدقہ جاریہ تعمیر کروائی تھی۔

ڈاکٹر صاحب کی نظامت کے زمانے میں ایک ایسے لڑکے اور لڑکی کا جامعہ میں داخلہ ہوگیا جن کا پورا خاندان مسلمان ہوگیا تھا مگر جب گھر کے مکھیا کا انتقال ہوگیا تو ان کی بیوی مرتد ہوگئی اور اس بات کی کوشش میں لگ گئی کہ میرے بچے بھی مرتد ہو جائیں، اس کے لیے اس نے اپنے دیار کے نیتاؤں کا سہارا لیا۔ اس وقت یوپی میں کلیان سنگھ وزیر اعلیٰ تھے، جامعہ پر الزام لگایا گیا کہ یہاں پر نو واردین کے بچے تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ جامعہ کے لیے یہ سخت آزمائش کا زمانہ تھا۔ اس وقت مولانا

نظام الدین صاحب جامعہ کے صدر مدرس تھے اور راقم نائب صدر تھا۔ جب ذمہ داران جامعہ سنت یوسفی ادا کرنے چلے گئے تو صدارت کے ساتھ ساتھ (معذرت کے باوجود) نظامت کی ذمہ داری بھی میرے ناتواں کندھوں پر ارکان انتظامیہ وذمہ داروں نے ڈال دی۔ جب میں نے اس ذمہ داری کو اٹھانے سے معذرت کرنا چاہی تو جناب مولانا ابوالبقاء ندویؒ صاحب نے کہا کہ اس وقت تو کوئی نہیں ہے، چند دن کا معاملہ ہے لہٰذا تم اسے دیکھ لو، بہر حال چند دنوں کے لیے میں اس ذمہ داری کا متحمل قرار پایا۔ مولانا کے جانے بعد شام کو باوثوق ذرائع سے پتہ چلا کہ آج رات جامعہ پر چھاپہ (Raid) پڑنے والا ہے۔ اس خبر کے ملنے کے بعد راقم نے یہ طے کیا کہ اب رات کو گھر جانے کے بجائے جامعہ میں ہی رہنا چاہیے۔ حسنِ اتفاق سے رات کو اتنی زوردار بارش ہوگئی کہ چاروں طرف پانی ہی پانی نظر آنے لگا، اس وجہ سے رات سکون سے گزری، پولیس رات کے بجائے صبح دس بجے آئی اور پورے میدان میں کمر بستہ ہوگئی۔ ہر کلاس کی تفتیش کی مگر مطلوبہ بچے کہیں نظر نہیں آئے، اس موقع پر پولیس چار بجے تک موجود رہی۔ مجھ سے سوال وجواب کا سلسلہ جاری رہا، صدارت ونظامت دونوں سے متعلق سوالات کیے جاتے رہے اور راقم جواب دیتا رہا، اس دوران اساتذہ اور طلبہ کا بھرپور تعاون حاصل رہا، معمول کے مطابق تعلیم چھٹی تک جاری رہی اور کوئی بدنظمی نہیں ہونے پائی۔ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے پولیس ناکام لوٹ گئی۔ صرف داخلہ رجسٹر کے علاوہ کوئی اور چیز ان کے ہاتھ نہیں لگ سکی۔ اس موقع پر ڈاکٹر خلیل احمدؒ صاحب شروع سے آخر تک اپنے موقف پر مضبوطی کے ساتھ ڈٹے رہے، ایک مرتبہ بھی آپ نے یہ نہیں کہا کہ ان بچوں کو ان کی ماں کے حوالے کردو۔

ڈاکٹر صاحب شبلی کالج انتظامیہ کے بھی ممبر تھے، وہاں کے لوگ آپ کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ میرے سامنے شبلی کالج کے بعض ممبران نے یہاں تک کہا کہ ڈاکٹر صاحب شبلی کالج کے صرف ممبر ہی نہیں بلکہ سرپرست کی حیثیت رکھتے ہیں، اس سے پتہ چلتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب ہر دل عزیز اور ہر طبقے میں یکساں معروف ومشہور تھے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی مغفرت فرمائے، ان کی کاوشوں کو قبول فرمائے، کروٹ کروٹ چین عطا فرمائے، جنت الفردوس میں مقام اعلیٰ نصیب فرمائے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

ڈاکٹر خلیل احمد صاحبؒ: نقوش وتاثرات

مولانا نعیم الدین اصلاحی

افسوس ہے کہ جناب ڈاکٹر خلیل صاحب علیگ ماہ مئی ۲۰۲۳ء کو اس جہان فانی سے کوچ کر گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم کی شخصیت جامعۃ الفلاح کے بانیوں میں بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ جامعۃ الفلاح کے قیام میں جہاں جماعت اسلامی کے ذمہ داران مولانا ابوبکر صاحب اصلاحیؒ اور مولانا ملک حبیب اللہ صاحب قاسمی کا کردار اہم ہے، وہیں اس کی علمی توسیع وترقی میں مولانا جلیل احسن ندویؒ، مولانا شبیر احمد اصلاحیؒ، اور مولانا عبدالحسیب صاحب اصلاحیؒ کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح مقامی لوگوں میں جناب حکیم ایوب صاحب ندوی، جناب ڈاکٹر ابرار صاحب، جناب حاجی عبدالمتین صاحب، جناب شیخ منیر صاحب، جناب حاجی امانت اللہ صاحب، جناب مولوی محمد عیسی صاحب کی کاوشیں بھی لائق ستائش ہیں۔ اسی طرح مولانا ابواللیث صاحب اصلاحی ندویؒ اور مولانا صدرالدین اصلاحیؒ کی خدمات بھی کم نہیں ہے۔ البتہ بانیانِ جامعۃ الفلاح میں جو لوگ ممتاز اور نمایاں تھے ان میں ڈاکٹر خلیل صاحب کا نام سرفہرست ہے۔ ڈاکٹر خلیل صاحب نے اپنی زندگی کے نہایت قیمتی لمحات جامعۃ الفلاح کی تعمیر وترقی میں لگا دیے اور اس کو عالمگیر شہرت کا حامل جامعہ بنا دیا۔ ڈاکٹر خلیل صاحب کی رحلت جامعۃ الفلاح کے بانیوں کی آخری یادگار کی رحلت ہے، اللہ تعالی مرحوم کی مغفرت فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلی مقام عطا فرمائے آمین۔

جناب ڈاکٹر خلیل صاحب سے ملاقات کا شرف

قصبہ بلریا گنج اور حکیم ایوب صاحب کے نام سے بچپن ہی سے مانوس ہو گیا تھا۔ ہمارے گاؤں کے کچھ لوگ بلریا گنج حکیم ایوب صاحب کے زیر علاج تھے اور اکثر آیا کرتے تھے، ان میں میرے برادر کلاں بھی تھے۔ ۱۹۸۰ء میں جامعہ اسلامیہ نیوتنی میں مدرس تھا، مدرسہ چھوٹا تھا، میری

صلاحیت ضائع ہورہی تھی۔اس لیے کسی عربی درسگاہ میں تدریس کا شدید خواہشمند تھا،اسی اثنا میں سہ روزہ دعوت میں جامعۃ الفلاح کا ایک اشتہار شائع ہوا،جس میں مختلف آسامیوں کی جگہ خالی تھی۔میں نے بھی درخواست دے دی تھی،اس وقت جامعۃ الفلاح کے ناظم اعلی مولانا ابواللیث صاحب اصلاحی تھے۔انہی کے نام سے میں نے درخواست بھیجی تھی،چند ہی دنوں بعد مجھے جامعۃ الفلاح کی طرف سے ایک لفافہ ملا،اس کو چاک کیا،دیکھا تو وہ اصل میں میرا تقرر نامہ تھا۔بے حد خوشی ہوئی کہ اب میری دیرینہ خواہش پوری ہورہی ہے کہ عربی تدریس کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک موقع فراہم کر دیا ہے۔ مشاہرہ دیکھ کر تھوڑا تردد ہوا،مجھے نیوتنی میں ۳۰۰ روپے ماہانہ مل رہے تھے اور جامعۃ الفلاح میں ۲۴۰ روپے ماہانہ کے لحاظ سے میرا تقرر عمل میں آرہا تھا۔۶۰ روپے ماہانہ کا خسارہ تھا لیکن یہ تردد دیر تک قائم نہیں رہا،کیونکہ جامعۃ الفلاح میں مجھے مولانا جلیل احسن ندویؒ سے استفادہ کا موقع مل رہا تھا جو میرے لیے بہت قیمتی تھا۔اس لیے میں نے فوراً جواب لکھ بھیجا کہ ایک مہینے کے بعد ان شاءاللہ جامعۃ الفلاح حاضر ہو جاؤں گا۔یہ خط وکتابت میرے اور ڈاکٹر خلیل صاحب کے درمیان تھی جو اس وقت نائب ناظم تھے،ڈاکٹر خلیل صاحب کا نام اس سے پہلے نہیں سنا تھا۔سب سے پہلے اسی خط وکتابت کے ذریعے ان کے نام سے آشنائی ہوئی۔میں وعدے کے مطابق اگست 1980 کے آخر میں صبح سویرے جامعۃ الفلاح پہنچا،صدر مدرس مولانا شبیر احمد اصلاحی صاحب سے ملاقات ہوئی،مولانا کو پہلے ہی سے پہچانتا تھا،پہلی ملاقات بنارس میں ہوئی تھی۔اس کے بعد مدرسۃ الاصلاح کے علاوہ جماعت کے اجتماعات میں بھی ملاقات رہی اور انہیں امباری کے اجتماع میں خطاب عام کرتے ہوئے دیکھا تھا۔مولانا نے اپنے کمرے میں (جو حسن البنا منزل کے پچھمی گیٹ شمال کی جانب تھا) میرا سامان رکھوایا اور دوسرے دن دفتر تعلیمات میں بلایا،تھوڑی سی رسمی گفتگو کے بعد فرمایا کہ آپ کا تقرر ہمہ وقتی نگراں کی حیثیت سے کیا گیا ہے،یہ سننا تھا کہ میرے پیر سے زمین سرک گئی،سوچا کہ فوراً لوٹ جاؤں لیکن کہاں جاؤں، نیوتنی سے تو اپنی کشتی جلا کر آ گیا تھا،پورے قصبے نے سمجھایا تھا لیکن میں نے ایک نہیں مانی اور چلا آیا،آخر اب کس منھ سے وہاں جاؤں گا۔

میرے ساتھ ہمہ وقتی نگراں کی حیثیت سے دو افراد کا اور تقرر ہوا تھا جن میں سے ایک مولوی خلیل صاحب غازی پوری تھے اور دوسرے مولوی شبیر فلاحی صاحب چوکنیاں تھے۔ان دونوں کا تقرر

کے بعد انٹرویو بھی ہو چکا تھا۔ ایک دن مجھے بتایا گیا کہ آج بعد نماز عشاء جناب ڈاکٹر خلیل صاحب نائب ناظم جامعۃ الفلاح کے روبرو آپ کو پیش ہونا ہے، وہ آپ سے انٹرویو لیں گے۔ انٹرویو کا لفظ سن کر بہت گھبرایا کیونکہ شبیر فلاحی صاحب نے ان کا جو تعارف کرایا تھا وہ بڑا منفی تھا کہ ڈاکٹر صاحب بہت سخت ہیں، میں بیمار تھا بخار میں مبتلا تھا، لیکن عشاء بعد دفتر نظامت میں ڈاکٹر خلیل صاحب سے جا کر ملاقات کی، ڈاکٹر صاحب نے دیکھتے ہی کہا آپ بیمار ہیں کیا؟ میں نے کہا، جی ہاں! ڈاکٹر صاحب نے نگرانی کے سلسلے میں کچھ نصیحتیں کی اور پھر رخصت کر دیا، میں بے حد خوش ہوا۔

جامعۃ الفلاح سے ڈاکٹر صاحب کا بے حد لگاؤ

اس وقت جامعۃ الفلاح کے ناظم مولانا ابواللیث صاحب ندوی اصلاحی تھے اور نائب ناظم ڈاکٹر خلیل صاحب علیگ تھے، مولانا ابواللیث صاحب ہفتے میں ایک دن شاید سنیچر کو آتے تھے مگر ڈاکٹر خلیل صاحب روزانہ اور کبھی کبھی دن میں کئی کئی بار آجاتے تھے۔ ایک دن ڈاکٹر صاحب دن میں تعلیمی وقت میں آئے مولانا شبیر صاحب (صدر مدرس) کو ساتھ لیا اور میں بھی ان لوگوں کے ساتھ تھا، بورڈنگ کے کمرے میں جاتے اور درجہ نہ جا کر بورڈنگ میں رہ جانے والے لڑکوں کا نام رجسٹر میں لکھتے اور آخر میں مولانا شبیر صاحب سے کہا کہ مولانا! اب اگر بورڈنگ میں لڑکے ملے تو اس کے ذمہ دار آپ ہوں گے۔ مولانا شبیر صاحب مرحوم ومغفور نے نہایت خندہ جبینی کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کا فرمان سنا اور ایفائے عہد کا وعدہ کیا۔ ڈاکٹر صاحب جب بھی مدرسے میں تشریف لاتے، مولانا شبیر صاحب از حد ان کا احترام کرتے۔ مولانا شبیر صاحب اصلاحی کے اندر بے پناہ صلاحیت تھی، انتظامی امور کے ماہر تھے، اکیلے مدرسے کو چلا رہے تھے، مگر بے حد متواضع اور خاکسار تھے۔ اپنے اساتذہ سے بھی اسی طرح خاکساری کے ساتھ پیش آتے، اس وقت ان کے اساتذہ میں مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی، مولانا جلیل احسن ندوی اور مولانا ابوبکر اصلاحی تھے، ان سب سے خاکسارانہ ملتے۔ مولانا عبدالحسیب اصلاحی ان کے استاد نہیں تھے مگر پھر بھی ان سے دب کر رہتے تھے۔ مولانا نظام الدین اصلاحی صاحب سے بچ کر رہنے کی کوشش کرتے، مگر نجی طور پر ڈاکٹر خلیل صاحب سے بڑی گہری چھنتی تھی۔

مجھے تعجب ہوتا تھا کہ ڈاکٹر صاحب سے مدرسے میں مولانا ملتے تو حاکم ومحکوم کا فرق نظر آتا تھا

مگران کے مطب پر جب ان سے ملتے تھے تو ان دونوں کے تعلقات برادرانہ محسوس ہوتے تھے۔ میں کئی مرتبہ مولانا کے ساتھ ان کے مطب پر ملا، ہر مرتبہ محسوس ہوا کہ مولانا سے بڑے گہرے مراسم ہیں اور صاف محسوس ہوتا کہ ڈاکٹر صاحب مولانا سے بڑی محبت اور اپنائیت رکھتے ہیں۔ جامعۃ الفلاح کے حلقہ تعارف کی توسیع میں مولانا شبیر صاحب اصلاحی اور ڈاکٹر خلیل صاحب کی خدمات کو کبھی بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

گزشتہ صدی کی آٹھویں دہی میں جب شیخ منیر صاحب ممبئی سے ریٹائر ہو کر اور حاجی عبدالمتین صاحب اپنی کاروباری مصروفیات چھوڑ کر ممبئی سے بلریا گنج آ گئے تو ان تینوں نے مل کر جامعہ کو آگے بڑھانے کے لیے بڑی مخلصانہ جدوجہد کی جس سے جامعہ کو بہت فائدہ پہونچا۔

جامعہ کے ملحق اداروں کے دورے

جامعہ کے ملحق اداروں کی تعلیم وتربیت کے معیار کو بلند کرنے کے لیے کبھی کبھی ڈاکٹر صاحب دورے بھی کرتے، جس میں جامعہ مصباح العلوم چوکنیاں اور جامعہ اسلامیہ نیوتنی خصوصاً قابل ذکر ہیں کیونکہ ان مقامات پر سفر میں ڈاکٹر صاحب کے ساتھ میں بھی رہا ہوں۔

ڈاکٹر صاحب اداروں کے معائنے کے درمیان سب سے زیادہ جس چیز پر توجہ دیتے وہ انگلش اور ریاضی کا سبجیکٹ ہوتا، ان دونوں مضامین پر ڈاکٹر صاحب خصوصی توجہ فرماتے اور کوشش کرتے کی تمام درجات کا معائنہ باریکی کے ساتھ کریں اور آخر میں ذمہ داران کے سامنے جائزہ رپورٹ پیش فرماتے جو بالعموم تنقیدی ہوتی اور احتساب میں قدرے شدت ہوتی۔ میں ڈاکٹر صاحب سے گزارش کرتا کہ ڈاکٹر صاحب معائنے کا یہ طریقہ مناسب نہیں ہے، جہاں طلبہ کی خامیوں کا ذکر کیا جائے وہیں طلبہ کے اندر جو خوبیاں ہیں ان کا بھی اعتراف ہونا چاہیے لیکن ڈاکٹر صاحب اس سے باز نہیں آتے۔ میں نے تو انہیں جامعۃ الفلاح میں شعبہ اعلی اور ثانوی کا جائزہ لیتے ہوئے اور پھر سخت ریمارک دیتے دیکھا ہے اور بسا اوقات شوری میں تعلیمی رپورٹ پر بحث کے دوران ڈاکٹر صاحب کا موقف نہایت سخت ہوتا، یہ سب بر بنائے اخلاص تھا۔ وہ جامعۃ الفلاح کے معیار تعلیم کو نہایت بلند دیکھنا چاہتے تھے اور معیار مطلوب پر طلبہ اور اساتذہ کو نہ پاتے تو برہم ہوتے اور اس کا اظہار برملا فرماتے تھے۔

جمیل صاحب (چار بھائی بیڑی ورکس)

جمیل صاحب (چار بھائی بیڑی ورکس) حیدرآباد میں جامعۃ الفلاح کے نہایت ہمدرد اور بہی خواہ تھے۔ اترولی ضلع علی گڑھ کے رہنے والے تھے۔ اپنے وطن علی گڑھ سے بڑی محبت رکھتے تھے۔ مجھ سے ایک روز فرمایا کہ جامعۃ الفلاح کی شاخ اترولی ضلع علی گڑھ میں قائم ہونی چاہیے۔ لہٰذا تم جامعۃ الفلاح کے ناظم ڈاکٹر خلیل صاحب کو اترولی لے کر جاؤ اور جائزہ لے کر بتاؤ کہ اس کے کیا امکانات ہیں؟ ہم دونوں علی گڑھ پہنچے اور وہاں سے مولانا سلطان احمد اصلاحی کو لیا اور ہم تینوں بذریعہ کار اترولی کے لیے نکل گئے۔ جمیل بھائی نے اترولی کے ایک صاحب (عبدالوہاب صاحب محلّہ چودھریان) کا پتہ دیا تھا اور ان کو بھی ہماری آمد اور مقصد سے باخبر کر دیا تھا۔ ہم لوگ اترولی پہنچ گئے، عبدالوہاب صاحب سے ملاقات کی گئی، قصبے کا جائزہ لیا گیا، اور جمیل صاحب کے محلے کی مسجد میں تمام مصلیان کو نماز ظہر کے بعد روکا گیا اور ان کے سامنے ایک مدرسے کی تجویز رکھی گئی۔ مصلیوں میں سے عموماً لوگ خاموش تھے، البتہ جمیل صاحب کے خاندان کے ایک صاحب نے اظہار خیال کرتے ہوئے فرمایا: تجویز تو بہت اچھی ہے اور اس سے پہلے عبدالحفیظ صاحب نے مدرسہ قائم کیا بھی تھا لیکن وہ چلا نہ سکے، اس لیے یہاں کسی مدرسے کا چلنا مشکل ہے۔ شام تک ہم لوگ علی گڑھ واپس آ گئے۔ رات میں ہم لوگوں نے آپس میں مشورہ کیا اور طے کیا کہ مدرسہ قائم کیا جائے اور جمیل صاحب کو پوری کارروائی کی اطلاع دے دی جائے۔ ڈاکٹر صاحب کے مشورے کے مطابق اس طرح کی ایک تحریر تیار کی گئی:

> ''یہاں ایک مدرسہ چل سکتا ہے، البتہ جامعۃ الفلاح کی شاخ نہیں، بلکہ ایک جدید ادارہ قائم کیا جائے اور علی گڑھ سے اس کی منظوری لی جائے۔''

یہ خط جمیل صاحب کو بھیج دیا گیا اور وہاں سے منظوری آ گئی اور مدرسہ قائم ہو گیا۔ کچھ دنوں تک مولانا سلطان اصلاحی کی سرپرستی میں چلا اور اس وقت سلطان اصلاحی کے بڑے صاحبزادے عرفان فلاحی کی زیرنگرانی چل رہا ہے۔ اس مدرسے کے معائنے کے لیے ڈاکٹر صاحب ایک بار تشریف لے گئے تھے اور معائنے کے بعد ہم تین لوگ مولانا سلطان احمد اصلاحی، ڈاکٹر خلیل صاحب اور میں

(نعیم الدین) حیدرآباد پہنچے اور دوسرے دن طے شدہ پروگرام کے مطابق جناب جمیل صاحب کی آفس مبارک منزل میں ایک نشست رکھی گئی، جس میں مدرسے کے نظام اور دستور کی تشکیل زیر بحث آئی، جس پر جمیل صاحب نے فرمایا، میں تو مدرسوں کے چلانے کا کوئی تجربہ نہیں رکھتا، البتہ ڈاکٹر صاحب جو بھی ہمیں حکم دیں ہم اسی کے مطابق عمل کرنے کی کوشش کریں گے۔ مولانا سلطان صاحب چاہتے تھے کہ باقاعدہ مدرسہ کے لیے کمیٹی تشکیل دی جائے، جس کے ارکان بلریا گنج، علی گڑھ اور حیدرآباد کے افراد پر مشتمل ہوں۔ اس سلسلے میں جناب جمیل صاحب نے ڈاکٹر صاحب کو ذمہ دار بنایا اور کہا کہ ڈاکٹر صاحب کمیٹی تشکیل دے کر مجھے اطلاع فرمائیں۔ میں اس کے مطابق عمل درآمد کی کوشش کروں گا۔ اس طرح ہم لوگ دو دن حیدرآباد میں قیام کر کے اپنے اپنے مقام پر واپس آ گئے۔ دو تین دن کے بعد میں ڈاکٹر صاحب سے ملنے ان کے مکان پر گیا اور ڈاکٹر صاحب سے اتر ولی کے مدرسے کی پیش رفت کے سلسلے میں دریافت کیا، ڈاکٹر صاحب نے مجھ سے فرمایا جمیل صاحب کو اطلاع کرو کہ جمیل صاحب کمیٹی میں صرف اپنے گھر کے افراد کو رکھیں تاکہ آئندہ چل کر کسی قسم کا تنازعہ نہ پیدا ہو سکے۔ میں نے فوراً ہی جناب جمیل صاحب کو ڈاکٹر صاحب کے مشورے سے آگاہ کیا، جمیل صاحب کا فوراً جواب آیا اور انھوں نے بھی ڈاکٹر صاحب کے مشورے کی تائید کی۔ اس طرح مدرسہ آزاد ادارے کی شکل میں سرگرم سفر ہے اور اتر ولی کے مسلمانوں کے لیے خصوصاً غریب مسلمانوں کے لیے بچوں کی تعلیم کا ایک اچھا دینی تعلیمی مرکز ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالی اس ادارے کو زیادہ سے زیادہ ترقی عطا فرمائے اور ڈاکٹر صاحب کے حسنات میں اسے اضافے کا ذریعہ بنائے، آمین

ڈاکٹر صاحب مرحوم علیگ تھے، عالم فاضل نہیں تھے مگر زہد و ورع سے متصف تھے۔ نام و نمود اور ریا سے کوسوں دور تھے۔ سب سے بڑی خوبی جو ان کے اندر میں نے دیکھی وہ یہ تھی کہ کسی کی غیبت نہیں کرتے تھے، حالانکہ یہ ایسی بیماری ہے جس میں بڑے بڑے علماء بھی گرفتار ہیں۔ ان کی موت سے جامعۃ الفلاح جہاں اپنے ایک محسن خادم سے محروم ہوا، وہیں جماعت اسلامی نے ایک مخلص کارکن کھو دیا۔ اللہ تعالی ان دونوں اداروں کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے اور ان کی ترقی کے سفر کو دوام بخشے، آمین۔

ڈاکٹر خلیل احمد صاحبؒ کا سانحۂ ارتحال

مولانا محمد طاہر مدنی

فجر کے وقت یہ افسوس ناک اطلاع ملی کہ سابق ناظم جامعہ محترم ڈاکٹر خلیل احمد صاحب کا رات ۱۲ بجے انتقال ہوگیا۔ کل وہ معمول کے مطابق تھے۔ مختلف لوگوں سے ملاقاتیں اور بات چیت کی، رات کا کھانا سب کے ساتھ کھایا اور حسبِ معمول سو گئے۔ ۱۲ بجے کے قریب طبیعت خراب ہوگئی اور چند منٹ میں سفرِ آخرت پر روانہ ہوگئے۔ اِنا للہ و اِنا اِلیہ راجعون، اللہ غریق رحمت کرے۔ آمین۔

ڈاکٹر صاحب نے ۱۹۵۶ء میں طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے طب کی تعلیم مکمل کی تھی۔ وہ ایک بہت کامیاب معالج تھے اور بطور خاص ماہرِ امراضِ اطفال تھے۔

ان کو فروغِ تعلیم سے بہت دلچسپی تھی۔ علی گڑھ سے واپس آنے کے بعد انہوں نے دیگر رفقاء کے ساتھ مل کر بلریا گنج کے قدیم مکتب کو ترقی دینے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ جامعۃ الفلاح کے مؤسسین میں ان کا نام بہت نمایاں ہے اور ادارے کی تعمیر و ترقی میں ان کا گراں قدر حصہ ہے۔ متعدد بار وہ ناظم رہے۔ پہلی بار ۱۹۶۳ سے ۱۹۶۹ء تک، دوسری بار ۱۹۹۰ سے ۱۹۹۳ء تک اور تیسری بار ۱۹۹۶ سے ۲۰۰۰ء تک نظامت کے فرائض انھوں نے بحسن و خوبی ادا کیے۔

جامعہ کے نصاب و نظام کی تشکیل میں ڈاکٹر صاحب کا بنیادی کردار رہا۔ وہ علیگ تھے، جدید تعلیم یافتہ تھے، لیکن ہمیشہ اس بات کے قائل رہے کہ جامعہ کا مقصد چونکہ علماء و دعاۃ کی تیاری ہے اس لیے نصابِ تعلیم میں علومِ اسلامیہ کا ہی غلبہ رہنا چاہیے۔ جامعہ میں شعبۂ اعلیٰ میں یہ اصول کارفرما رہا ہے کہ چھ پیریڈ عربی زبان و قواعد اور اسلامیات کے لیے اور دو پیریڈ جدید علوم کے لیے مختص رہے۔ معلّمین و معلّمات کی ٹریننگ پر توجہ دیتے تھے اور اس کے لیے ورکشاپ و ٹریننگ کیمپ کا انعقاد کراتے تھے۔ معیارِ تعلیم کی بلندی کی تدابیر پر زور دیتے تھے۔

جامعہ کے ترقیاتی منصوبوں کے لیے مرحوم نے بڑی محنت کی۔ آئی ڈی بی جدہ سے جامعہ کے لیے گرانٹ منظور ہوگئی تھی، لیکن FCRA نہ ہونے کی وجہ سے رقم ریلیز نہیں ہو پا رہی تھی۔ شیخ منیر احمد صاحب کے ساتھ مل کر ڈاکٹر صاحب نے بڑی محنت کی اور بالآخر سرٹیفکیٹ حاصل کیا اور رقم ریلیز ہوگئی۔ اس گرانٹ سے کلیۃ البنات میں ہاسٹل اور جامعہ کے کیمپس میں شان دار مرکزی لائبریری کی تعمیر ہوئی۔ اس سلسلے میں مرحوم نے دہلی اور حیدرآباد کے متعدد اسفار کیے۔

ستّر کی دہائی میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے جامعہ کی اسناد کو منظور کرانے میں ڈاکٹر صاحب کا بنیادی کردار تھا۔ اس کے بعد دیگر یونیورسٹیوں سے بھی منظوری کا سلسلہ شروع ہوگیا۔

پروانچل یونیورسٹی سے جامعہ کی سند منظور کرانے کا مرحلہ تھا، شبلی کالج کے سابق پرنسپل ڈاکٹر افتخار احمد صاحب کے ساتھ ڈاکٹر صاحب نے بڑی محنت کی، یونیورسٹی کے وفد کا دورہ کرایا اور تمام شرائط کی تکمیل کے لیے جدوجہد کی۔

وہ تحریکِ اسلامی کے ایک سپاہی تھے۔ جماعتِ اسلامی کے رکن کی حیثیت سے بڑی خدمات انجام دیں۔ بلریا گنج میں جماعتِ اسلامی کی جانب سے یتیم بچوں کے لیے گلشنِ اطفال قائم ہوا تو اس کے صدر کی ذمہ داری نبھائی اور اس کی تعمیر وترقی میں بنیادی کردار ادا کیا۔ دینی تعلیمی تحریک انجمن تعلیماتِ دین کے بینر تلے علاقے میں مکاتب کے قیام میں نمایاں کردار ادا کیا۔

جامعہ کی خوش قسمتی ہے کہ اس کے مؤسسین میں قاسمی، اصلاحی، ندوی، علیگ سب شامل ہیں، چنانچہ جامعہ میں ایسا نصابِ تعلیم نافذ ہوا جو جدید وقدیم علوم کا بہترین امتزاج اور حسین سنگم ہے۔ چونکہ یہ حضرات تحریکِ اسلامی سے وابستہ تھے اس لیے جامعہ کے نصابِ تعلیم اور نظامِ تربیت میں تحریکی اور دعوتی اسپرٹ کارفرما ہے۔ جامعہ کے پیشِ نظر ایسے افراد کو تیار کرنا ہے جو دعوت واصلاح کا فریضہ بطریقِ احسن ادا کرسکیں۔

مرحوم جامعہ کی شوریٰ کے بنیادی رکن تھے۔ شوریٰ کے اجلاس میں پابندی سے شریک ہوتے تھے۔ تعلیمی معائنے کرتے تھے اور معیار کی بلندی کے لیے برابر کوشاں رہتے تھے۔ ان کا نظریۂ تعلیم جدید وقدیم کے سنگم سے عبارت تھا۔ معلّمین ومعلّمات کی فنی ٹریننگ کی طرف توجہ دیتے تھے۔ نوجوانوں کو تعلیم کی طرف متوجہ کرتے تھے اور ان کی تعلیمی رہنمائی کرتے تھے۔ ان کی پوری زندگی تحریکِ

اسلامی اور فروغِ تعلیم کے لیے وقف تھی۔

۹۲ برس کی عمر میں ان کی رحلت ہوئی، جدوجہد اور سعی وعمل سے بھرپور زندگی گزاری۔ روشن نقوشِ حیات چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہوئے۔ تعلیم کے میدان میں ان کی خدمات بہت عظیم ہیں۔ جامعہ کی تعمیر وترقی میں ان کا کنٹری بیوشن ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ اللہ ان کی خدمات کو قبول فرمائے، جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور تمام متعلقین کو صبر کی توفیق بخشے، آمین۔

مرحوم ڈاکٹر خلیل احمد صاحب کی یاد میں

ڈاکٹر ابوشحمہ

دنیا میں کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ وہ دنیا سے گزر جاتے ہیں لیکن ہمیشہ اپنے موجود ہونے کا احساس دِلا جاتے ہیں، جن میں ایک مرحوم ڈاکٹر خلیل احمد صاحب ہیں۔ وہ تو دنیا سے گذر گئے، لیکن اپنے کارناموں سے ہمیشہ یاد کیے جائیں گے۔

کڑے سفر کا تھکا مسافر تھکا ہے ایسا کہ سو گیا ہے
خود اپنی آنکھیں تو بند کرلیں ہماری آنکھیں بھگو گیا ہے

ریاست اتر پردیش کے ضلع اعظم گڑھ کے ایک قصبہ بلریا گنج میں پیدا ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب کی پیدائش یکم نومبر ۱۹۳۳ء کو ایک زمیندار گھرانے میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم بلریا گنج کے اسلامیہ اسکول میں ہوئی، اس کے بعد بلریا گنج کے ہی مڈل اسکول سے درجہ ہشتم کی تعلیم مکمل کر کے اعظم گڑھ شہر کے ویسلی انٹر کالج میں داخلہ لیا۔ وہاں سے ہائی اسکول کرنے کے بعد، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طبیہ کالج میں B.U.M.S. میں داخلہ لیا۔ وہاں سے تعلیم مکمل کرنے کے بعد ۱۹۵۶ء میں واپس بلریا گنج آ گئے۔ شروع میں کئی سالوں تک ضلع مئو کے گھوسی قصبہ میں پریکٹس کی۔ گھر والوں کے اصرار پر پھر بلریا گنج واپس آ گئے اور مستقل یہیں پر دواخانہ کھول کر بیٹھ گئے۔ اس وقت بہت دور دور تک ڈاکٹر نہیں تھے۔ چونکہ ڈاکٹر صاحب کافی ذہین تھے اس لیے میڈیکل لائن میں کافی آگے بڑھتے چلے گئے۔ میں نے خود مشاہدہ کیا کہ ان کی پریکٹس بہت شاندار تھی۔

ایک تعلیم یافتہ گھرانے میں آنکھیں کھولنے کا جو سب سے بڑا فائدہ انھیں ہوا وہ یہ کہ بچپن سے ہی ان کی تعلیم و تربیت کا کافی خیال رکھا گیا۔

بڑے آدمیوں کو مطالعے کا شوق جنون کی حد تک ہوتا ہے۔ کتابوں سے یہ دوستی جو اکثر بچپن

سے شروع ہوتی ہے، عمر بھر قائم رہتی ہے۔ میں نے ڈاکٹر صاحب میں یہ چیز پائی۔

ڈاکٹر صاحب میرے والد محترم جناب مرحوم نبی سرور خان صاحب کے ساتھیوں میں سے تھے، میں نے اکثر ان کو اپنے والد صاحب کے ساتھ محوِ گفتگو دیکھا۔ میرا تعلق ڈاکٹر صاحب سے اس وقت زیادہ ہوا جب میں ۱۹۸۸ء میں جامعۃ الفلاح کی انتظامیہ کا ممبر بنا۔

مقصد حیات اور خدا ترسی انسان کو بلند مقام دیتی ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ ڈاکٹر صاحب کا جامعۃ الفلاح سے بہت گہرا تعلق رہا۔ وہ فلاح کے تین بار (1969-1963؛ 1993-1990؛ 2000-1996) ناظم رہے۔

میں نے پایا کہ ڈاکٹر صاحب نے جامعۃ الفلاح کے لیے خود کو وقف کر دیا تھا۔ مجھ سے بار بار کہتے تھے کہ تعلیم کا معیار بہتر بنانے کے لیے آپ زیادہ سے زیادہ وقت دیجیے۔ کبھی استاد کی قلت ہوتی تو مجھ سے کہتے کہ چلیے بہار میں کشن گنج میں ایک بڑا کالج ہے۔ وہاں سے اچھا استاد لے آیا جائے۔ میں ان کے ساتھ ۴، ۵ روز کے سفر پر کشن گنج گیا اور اپنے مقصد میں کامیاب رہا۔ ناظم رہتے ہوئے اکثر مجھ سے کہتے تھے کہ چلیے کلاس کا معائنہ کیا جائے۔ ایسے لوگوں کا دنیا سے چلے جانا ایک بڑا خسارہ ہے۔

آپ بڑے ہی خوش اخلاق انسان تھے۔ قوم وملت کے ہمدرد تھے۔ آپ بڑے ہی صابر وشاکر انسان تھے۔ میرے دل میں ان کی بہت قدر ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی خدمات کو شرف قبولیت بخشے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ ان کے گناہوں کو معاف فرمائے۔ آمین

میرے محسن میرے مربی!

ماسٹر شاہ نواز

موت سب سے بڑی سچائی ہے اور سب سے تلخ حقیقت۔ یہ دنیا دار القضا ہے۔ ہر ذی روح کو موت کا مزہ چکھنا ہے۔ ڈاکٹر صاحب بھی دنیا کو اسی طرح چھوڑ کر چلے گئے جس طرح ہر انسان کو جانا ہے۔ اس عالمِ فانی میں جو بھی آتا ہے، جانے ہی کے لیے آتا ہے اور ہر جانے والا اپنے پیچھے اپنے اعزہ واقارب اور متعلقین کو سوگوار چھوڑ جاتا ہے۔ لیکن کچھ جانے والے ایسے ہوتے ہیں جن کے جانے سے صرف رشتے ناطے (رشتہ دار) ہی مغموم نہیں ہوتے بلکہ اطراف واکناف کے علاقے بھی ماتم کدہ بن جاتے ہیں۔ ایسے ہی جانے والوں میں ایک مرحوم ڈاکٹر خلیل احمد صاحب بھی تھے، جو اپنی گوناگوں خوبیوں کی وجہ سے عرصۂ دراز تک یاد رکھے جائیں گے۔

موت اس کی ہے کرے جس کا زمانہ افسوس

اللہ تعالیٰ ہر انسان کو مختلف خوبیوں سے نوازتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی محنت وذہانت کے سبب اس وقت جب کہ پڑھنے لکھنے کا نام ورواج نہ تھا، اطراف میں پڑھے لکھے لوگ خال خال ہی نظر آتے تھے، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کا رخ کیا اور وہاں سے طب کی ڈگری سے سرفراز ہوکر لوٹے اور علاقے میں ایک ماہر طبیب کی حیثیت سے اپنی شناخت بنائی۔ لیکن ان کے فکر ومزاج کی جولانی نے، جو کہ فرزندانِ ملت کی تعلیم وترقی کے تعلق سے فطرت میں رچی بسی تھی، انھیں چین سے بیٹھنے نہ دیا، جس کا اشارہ وہ اپنی گفتگو میں کیا کرتے تھے۔ اپنے اس مقصد کی تکمیل کے لیے فلاح کی سرزمین میسر آئی اور اللہ تعالیٰ نے ان کے عزائم کی تکمیل کا موقع عطا فرمایا۔

خواب کیا تھا؟ ان کی خواہشات کیا تھیں؟ ''ملت کے نوجوان زیورِ تعلیم سے آراستہ وپیراستہ ہوجائیں، ان کی تعلیمی پس ماندگی اور زبوں حالی دور ہوجائے''۔

جامعۃ الفلاح قدیم وجدید تعلیم کا مرکز بن جائے۔ایک ایسا نصاب تعلیم مرتب کیا جائے جو جدید وقدیم کا بہترین امتزاج ہو۔

ایک خواب، وہ خواب جو انھوں نے جاگتی آنکھوں سے دیکھا تھا، نصرت الٰہی سے اس کی تکمیل کا وقت قریب آ گیا تھا۔ اپنی مصروف ترین اور بہترین پریکٹس سے انھوں نے وقت فارغ کر کے، جامعہ کے لیے وقت لگانا شروع کر دیا اور اپنے چند ہم نواؤں کے ساتھ لائحہ عمل تیار کرنا شروع کر دیا۔ جامعہ جو اس وقت ایک ننھا سا پودا تھا۔ دھیرے دھیرے ایک تناور درخت کی شکل اختیار کرتا چلا گیا۔ جس کی جڑیں آج زمین کی گہرائی میں پیوست ہیں۔ درمیان میں ایک وقت ایسا بھی آیا کہ موصوف نے اپنی جمی جمائی پریکٹس کو خیر باد کہہ دیا، جب کہ وہ ابھی بہترین صحت کے مالک تھے، اور جامعہ کے لیے اپنے آپ کو مکمل طور سے وقف کر دیا۔ آج کا جامعہ ان ہی بزرگوں کی محنت اور کاوشوں کا نتیجہ ہے جو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں، یہ ان کی اور ان جیسے مخلصوں کے خوابوں کی تعبیر ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے تعلیمی میدان میں غیر معمولی نقش ثبت کیے، جامعۃ الفلاح کو نئی بلندیاں فراہم کیں۔ مختلف یونی ورسٹیوں سے الحاق کا سلسلہ آپ ہی کے ہاتھوں شروع ہوا۔ اپنے اثر ورسوخ کا استعمال کرتے ہوئے سب سے پہلے علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سے الحاق کرایا۔ جامعہ کے علاوہ آپ کی کوششوں سے ایک یتیم خانہ (گلشنِ اطفال) کا قیام عمل میں آیا۔ ایک قطعۂ زمین اس کے لیے وقف کیا جس میں ایک مسجد کی تعمیر بھی شامل ہے۔ اپنے گھر کے قریب ایک دوسری مسجد (مسجدِ عمر کے نام سے) تعمیر کرائی۔ جس میں طلبہ اور نوجوانوں کے استفادہ کے لیے ایک مختصر لائبریری بھی قائم کی۔ محلے کے بچوں کو پڑھانے اور ان کے اندر علمی شوق پیدا کرنے کے لیے ہمہ وقت کوشاں رہے۔ آپ شبلی کالج کی انتظامیہ کے ممبر رہے اور مجلس شوریٰ کو مفید مشوروں سے نوازتے رہے۔ وہاں ایسے مواقع بھی آئے کہ اپنے بیٹوں اور اعزہ کا تقرر کروا سکتے تھے لیکن انھوں نے اپنے اصولوں سے سمجھوتہ نہیں کیا اور ذمہ داران کی شرائط کو نہایت سختی کے ساتھ ٹھکرا دیا اور مسترد کر دیا۔

ڈاکٹر صاحب تحریک کے کاموں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے، ایام صحت میں تمام اجتماعات میں شرکت کرتے۔ بیت المال کی اعانت کے علاوہ تحریک کے مادی استحکام کے لیے ہمہ وقت پیش پیش ہوتے۔

ڈاکٹر صاحب کی ایک نمایاں خوبی یہ بھی تھی کہ وہ رشتوں کا بہت زیادہ پاس ولحاظ رکھتے تھے اوران کی ضروریات کی تکمیل بھی کیا کرتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب ایک شجر سایہ دار کے مثل تھے۔ ان کی شخصیت کے سایہ سے بہت سارے لوگ مستفیض ہوا کرتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب کا میرے گھر بہت آنا جانا ہوتا تھا، چوں کہ میں ان کے گاؤں سے ہی تعلق رکھتا ہوں۔ میرے عزیز تھے اور بہت گہرا رشتہ تھا اور اس رشتے کو پائیداری بھی موصوف ہی نے بخشی۔ موصوف میرے ہم زلف ہوتے تھے، گوکہ عمر میں بہت زیادہ تفاوت تھا، قریب ۲۵-۳۰ سال کا فرق۔ میں ان کے بڑے بیٹے کا ہم عمر تھا۔ اکثر وبیشتر بعد نماز فجر ہمارے گھر تشریف لاتے، ہماری خیریت معلوم کرتے، ہماری تربیت کا سامان کرتے، پڑھنے کے لیے کتابیں دیتے، تعلیم وتعلم کے موضوع پر گفتگو کرتے۔ چوں کہ میں بھی جامعۃ الفلاح سے منسلک تھا اس لیے وہاں کی تعلیم وتربیت اور تعمیر وترقی موضوع سخن ہوتی۔

آج سے چالیس سال قبل کی بات ہے۔ نمازِ فجر کے فوراً بعد ہمارے غریب خانہ پر تشریف لائے۔ میں خواب غفلت سے بیدار ہوا، شرمندہ شرمندہ سا اٹھا۔ آپ نے نہایت شفقت کے ساتھ چند نصیحتیں کیں، جو میں نے گرہ میں باندھ لیں۔ وہ دن اور آج کا دن۔ اللہ تعالیٰ موصوف کو جزائے خیر عطا فرمائے، میری فجر کی جماعت فوت نہیں ہوئی۔

میں ان کے گھر کے ایک فرد کی حیثیت رکھتا تھا۔ ان کے اکثر بیٹے کم وبیش میرے ہم عمر تھے۔ میرا بیش تر وقت اِدھر ہی گزرتا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ آج سے پچاس سال پہلے اپنے بیٹوں، بیٹیوں اور بعد میں بہوؤں کے، ایک ایک دروازے پر دستک دیتے اور نماز فجر کے لیے جگاتے۔

موصوف بعد نماز عشاء سونے کے عادی تھے۔ سویرے سونا اور سویرے اٹھنا ان کا روزمرہ کا اُصول تھا۔ نماز فجر سے بہت پہلے بیدار ہوجاتے اور اپنے رب کے حضور سجدہ ریز ہوتے اور آہِ سحر گاہی کے واسطے سے رب کی رضا کے طالب ہوتے۔ آخری ایام میں تو تعلق باللہ بہت مضبوط ہوگیا تھا۔

یہ ذکر بھی کچھ بے جا نہ ہوگا کہ ڈاکٹر صاحب کی پرورش بڑے ناز ونعم سے ہوئی۔ والدین کی اکلوتی اولاد تھے۔ والدہ محترمہ کا سایہ بچپن ہی میں سر سے اٹھ گیا تھا۔ والدِ محترم ہی اب ماں اور باپ دونوں تھے، ان پر جان چھڑکتے، دھوپ چھاؤں اور موسمی اثرات سے بچاؤ کی تدبیر وتلقین کرتے۔

نہایت محبت وشفقت سے پرورش ہوئی۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ لاڈ پیار سے بگڑ جاتے، لیکن والد صاحب کی تربیت اور ڈاکٹر صاحب کی صالحیت نے ایسا کچھ نہ ہونے دیا۔

میں نے یہ بھی دیکھا کہ والد محترم دن میں کئی کئی بار ڈاکٹر صاحب کے مطب کا چکر لگاتے، محبت اور شفقت سے ان کو دیکھتے اور اپنی آنکھیں ٹھنڈی کرتے اور بغیر کچھ کہے سنے واپس آجاتے۔

ڈاکٹر صاحب بھی اپنے والد محترم پر جان چھڑکتے تھے۔ میری ان آنکھوں نے وہ منظر بھی دیکھا کہ والد صاحب بستر علالت پر ہیں، آخری وقت ہے، جاں کنی کا عالم ہے، والد ماجد کا سر گود میں ہے، ڈاکٹر صاحب زار وقطار رو رہے ہیں اور بآوازِ بلند کلمہ طیبہ کا ورد کر رہے ہیں۔ اِسی حالت میں روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔

میں نے وہ منظر بھی دیکھا کہ ڈاکٹر صاحب کے فرزندان پروانہ وار ڈاکٹر صاحب کی ایک ایک ادا پر نثار ہو رہے ہیں، ان کے کسی بھی اشارے کے منتظر ہیں۔ اُن کے چھوٹے بیٹے ''عبید الرحمٰن'' نے تو بطور خاص اپنے آپ کو ابا جان کی خدمت کے لیے وقف کر دیا تھا۔ گھر کی نشست و برخاست ہو کہ مسجد کی آمد و رفت یا خورد و نوش کا موقع، ہر وقت سائے کی طرح ان کے ساتھ لگے رہتے تھے۔ اور ایسا کیوں نہ ہو، یہ چیزیں تو وراثت میں ملی تھیں۔ کیا خوب حق ادا کیا خدمتِ والدین کا، ان کے بچوں نے، قابلِ رشک اور قابل ستائش!

آخری وقت میں بچے کچھ ملول تھے کہ ہم سے کوتاہی ہوئی، آخری دن ہم ابا کا کچھ خیال نہ رکھ سکے۔ ہوا یوں کہ سب کچھ معمول کے مطابق رہا۔ بعد عشاء مہمانوں کے ساتھ کھانا کھایا پھر بستر پر دراز ہو گئے۔ ایک بیٹے انیس الرحمٰن ان کے بازو میں سوئے ہوئے تھے۔ کچھ دیر کے بعد اُن کی آنکھ لگ گئی۔ کچھ دیر بعد ان کی آنکھ کھلی تو دیکھا کہ ابا کھڑے کھڑکی سے باہر جھانک رہے ہیں، کہا کہ ابا سو جایئے، ابھی بہت رات باقی ہے۔ بستر پر سلایا۔ پھر کچھ دیر بعد آنکھ کھلی تو دیکھا کہ ابا جان بستر پر بیٹھے ہیں، کہا کہ ابا سو جایئے، ابھی سویرا نہیں ہوا ہے۔ ابا کو سلا کر خود بھی سو رہے۔ کچھ زیادہ دیر نہ گزری تھی، گیارہ بجے تھے، دیکھا کہ ابا کچھ بے ترتیب سے بستر پر سو رہے ہیں۔ گھبرا کر اٹھے تو دیکھا (محسوس کیا) کہ ڈاکٹر صاحب جان، جان آفریں کے سپرد کر گئے ہیں۔ دوسرے بھائیوں کو آواز دی، سب بھاگے آئے۔ ڈاکٹر کو بلایا گیا، لیکن ڈاکٹر صاحب تو سفرِ آخرت پہ جا چکے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے کسی کو کچھ

زحمت دیے بغیر، کسی کی خدمت لیے بغیر، بغیر کچھ کہے، چپکے سے اپنا آخری سفر طے کرلیا۔ کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ اس سفر میں کوئی کسی کا ساتھ نہیں دیا کرتا۔

بچھڑا کچھ اس ادا سے کہ رُت ہی بدل گئی
اِک شخص سارے شہر کو ویران کرگیا

موت کا تو ایک وقت متعین ہے۔ٹھیک اپنے وقت سے آتی ہے۔نہ کسی کے مانگے ملتی ہے اور نہ کسی کے ٹالے ٹلتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنے بچوں، بچیوں حتیٰ کہ پوتوں اور پوتیوں کی بہترین تعلیم وتربیت کا حق ادا کردیا۔انہیں زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ان کے بچوں نے بھی خدمتِ والدین کی اہمیت کو سمجھا اور جانا۔اس پہلو سے انھیں ملول اور دل گرفتہ نہ ہونا چاہیے کہ کماحقہ ان کی خدمت نہ کرسکے۔ والدین کا ایک حق جو باقی رہ جاتا ہے، اُس کی ادائیگی کی فکر کرنی چاہیے، اپنی مقدرت بھر ان کے لیے دعائے خیر کرنا چاہیے اور جو فکر انھوں نے چھوڑی ہے اس کے لیے ہمہ وقت فکرمند رہنا چاہیے۔

ایک ابھری ہوئی خوبی ڈاکٹر صاحب کی یہ بھی تھی کہ وہ بہت ہی سادہ دل، سادہ طبیعت اور سادہ مزاج تھے۔تکلف، تصنع اور ظاہرداری سے کوسوں دور تھے۔ ہر ایک سے اس کے شایانِ شان برتاؤ کرتے۔اُس سے اسی طرح ملتے جیسے ملنا چاہیے۔ مرحوم بڑے مہمان نواز تھے۔گھر آئے مہمان کی خوب خوب خاطر تواضع کرتے۔عمر کے ساتھ ساتھ ان تمام خوبیوں میں مزید نکھار پیدا ہوگیا تھا۔

آخر میں اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ موصوف کی حسنات کو قبول فرمائے، کوتاہیوں سے صرف نظر فرمائے اور ان کے وارثین میں سے ان کا نعم البدل عطا فرمائے نیز تمام متعلقین کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔

ڈاکٹر خلیل احمدؒ: عمل اور جہد مسلسل کا ایک نام

مولانا محمد اسماعیل فلاحی

جامعۃ الفلاح، بلریا گنج کے قیام اور تعمیر و ترقی میں جن بے لوث مخلص خادموں کا نام لیا جا سکتا ہے ان میں ایک نمایاں اور ممتاز نام ڈاکٹر خلیل احمدؒ کا ہے۔ وہ بلریا گنج کے ایک بڑے زمین دار گھرانے کے اعلیٰ تعلیم یافتہ چشم و چراغ تھے۔ جوانی کے ابتدائی ایام میں ان کے اندر بڑا کرّ وفر اور شاہانہ انداز نظر آتا تھا۔ جماعت اسلامی سے جب تعلق ہوا اور اپنے فرائض منصبی کا احساس جاگا تو یہ شاہانہ انداز رخصت ہوا اور زندگی اللہ کے کلمے کی سربلندی کے لیے وقف ہوگئی۔

اپنے رب کی بندگی اور اس بندگی کو عام کرنے کے لیے انھوں نے اپنے رب سے جو عہد باندھا، اس عہد پر مرتے دم تک قائم رہے۔

اسلام کی نشاۃِ ثانیہ اور احیائے امت کے لیے وہ ملت کو علمی میدان میں اوپر اٹھانا چاہتے تھے، اسی لیے انھوں نے تعلیم کے محاذ پر اپنی صلاحیتیں لگائیں۔ وہ سمجھتے تھے کہ علم کے بغیر کوئی قوم ترقی نہیں کرسکتی اور اسلام کی تو بنیاد ہی علم پر ہے۔ پھر وہ علم کے معاملے میں عصری اور قدیم کی تفریق کے بھی قائل نہیں تھے۔ اسی طرح وہ ''تربیت وتزکیہ'' کے بغیر تعلیم کو مفید نہیں مانتے تھے۔

گروہی اور مسلکی تعصّبات سے اوپر اُٹھ کر عصری علوم کے ساتھ قرآن وسنت کی تعلیم اور ایسے رجال کار کی تیاری جو شہادتِ حق کے فریضہ کی ادائیگی کے ساتھ ملت کی کشتی کو ساحل مراد تک پہنچانے کا حوصلہ رکھتے ہیں، جامعۃ الفلاح کا مقصدِ قیام ہے۔ اس کا منہج تعلیم، نصابِ تعلیم اور اس کے فارغین اس بات کا ثبوت ہیں۔ جامعۃ الفلاح کو یہ رخ ڈاکٹر خلیل احمد صاحب اور ان کے رفقائے کار نے دیا ہے۔ (رفقائے کار سے میری مراد اُس وقت کی شوریٰ کے افراد اور اُس وقت کے اساتذہ کرام ہیں)

ڈاکٹر صاحب مختلف اوقات میں جامعہ کی نظامت کے علاوہ دوسرے مناصب پر، بلا معاوضہ،

اعزازی طور پر فائز رہے ہیں۔ان کا یہ پورا دور صاف شفاف ہے۔جامعہ کے اندر تعلیم کو بہتر بنانے کی جانب ان کی توجہ رہی ہے۔تعلیمی سرگرمیوں کا بذات خود جائزہ لیتے،کبھی کبھی کلاسوں میں پہنچ جاتے۔ اساتذہ سے ان کا تعلق حاکم اور رعایا کا سا نہیں تھا۔ہر شخص ان تک پہنچ سکتا تھا۔ایک معمولی طالبِ علم اور چپراسی کے لیے بھی ان کا دروازہ بند نہیں تھا۔لوگ اساتذہ اور طلبہ کو اپنا غلام نہیں سمجھتے تھے،اساتذہ کے تقرر میں صلاحیت،مفادِ جامعہ اور مفادِ ملت کو ملحوظ رکھتے۔ان کو جو اساتذہ ملے تھے وہ بھی اپنی مثال آپ تھے۔

ڈاکٹر صاحب کے ساتھ سیٹھ عبدالمتین صاحب،شیخ منیر احمد صاحب ایک ٹیم کی طرح ساتھ ساتھ نظر آتے ہیں۔میں ان سب کے ساتھ رہا ہوں۔میرے خیال میں ان حضرات کا دور جامعہ کا سنہری دور تھا۔یہ وہ دور تھا جس میں نظامت کے لیے ایک دوسرے کی ٹانگ نہیں کھینچی جاتی تھی اور ایک دوسرے کی پگڑی نہیں اچھالی جاتی تھی۔

علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سے جامعہ کا الحاق کرانے میں ڈاکٹر صاحب کا کلیدی کردار ہے۔

ڈاکٹر صاحب اور ان کے ساتھیوں نے جامعۃ الفلاح کے اندر تحریک اسلامی اور اس کے مفاد کو اول نمبر پر رکھا،اسی کا نتیجہ ہے کہ زمانہ کی ہزار گردشوں کے باوجود یہ ادارہ آج بھی تحریک کا ادارہ سمجھا جاتا ہے۔

ڈاکٹر خلیل احمد صاحب نے شبلی کالج اور بعض دوسرے تعلیمی اداروں کی تعمیر وترقی میں بھی حصہ لیا ہے۔بہ طور خاص شبلی کالج ان کی توجہات کا مرکز رہا ہے۔ڈاکٹر صاحب نے اپنے خاندان کی زمین پر،جس میں بڑا حصہ خود ان کی اپنی زمین کا ہے،یتیم بچوں کے لیے ''گلشن اطفال'' کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا،جس کی تعلیم وترقی اور انتظام وانصرام میں آخر وقت تک لگے رہے۔

بہار کے ''کشن گنج'' میں 'انسان اسکول' ایک زمانہ میں بڑی روشن تاریخ رکھتا تھا،کہتے ہیں کہ اس کے پاس علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سے بڑھ کر زمینیں تھیں۔پورا اسکول جھونپڑیوں کی شکل میں تھا۔تعلیمی اعتبار سے اس نے بڑی ترقی کی تھی اور برابر کر رہا تھا۔اس کے ڈائریکٹر جنھوں نے اسے قائم کیا تھا،غیر معمولی قوتِ کار(stamina) کے مالک تھے۔چوبیس گھنٹوں میں دو تین گھنٹوں سے زیادہ آرام نہیں کرتے تھے۔ان کا سارا وقت،تعلیم،اسکول اور اس کے مسائل کے لیے وقف تھا۔لگتا تھا

کہ یہ ادارہ دوسری علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی بنے گا۔لیکن اسے امت کی بدنصیبی کہیے کہ یہ اسکول اندرونی خلفشار کا شکار ہوگیا۔اساتذہ اور ڈائریکٹر کے درمیان شدید رسہ کسی شروع ہوگئی۔

ڈاکٹر خلیل احمد صاحب اس ساری صورت حال پر نگاہ رکھے ہوئے تھے اور بڑے متفکر تھے، بالآخر انھوں نے وہاں جانے کا ارادہ کرلیا۔ایک وفد کے ساتھ 'انسان اسکول' پہنچے۔وفد میں راقم کے علاوہ ڈاکٹر ابوشحمہ صاحب جو شبلی کالج میں استاد تھے اور اس وقت جامعہ میں معتمدِ مال ہیں۔اور 'لار' کے عبدالرزاق بزمی مرحوم جو دفترِ نظامت سے وابستہ اور ایک باکمال شاعر تھے، شامل تھے۔کئی دن اس وفد نے وہاں قیام کیا۔اساتذہ اور ڈائریکٹر سے بار بار ملاقاتیں کیں۔اس موقع پر برادرِ محترم ڈاکٹر ابوشحمہ صاحب کی صلاحیت کھل کر سامنے آئی۔وہ گفتگو کی اچھی صلاحیت اور نزاعی امور کو سلجھانے کا اچھا سلیقہ رکھتے ہیں۔ان سب نے اپنی پوری قوت صرف کردی لیکن افسوس ہے کہ ہم لوگ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوسکے اور ایک ابھرتا ہوا تعلیمی ادارہ باہمی اختلافات اور مفادات کی بھینٹ چڑھ گیا۔

ڈاکٹر صاحب کی جماعت سے وابستگی مثالی حد تک تھی۔اپنے پوتے خان یاسر کی صلاحیت کا بڑے فخر سے ذکر کرتے تھے۔خان یاسر کی ایس ائی او اور پھر جماعت کے اندر سرگرمی دیکھ کر بہت خوش ہوتے۔مجھ سے ان کی سرگرمیوں کی بابت سوال کرتے اور جواب سن کر محسوس ہوتا کہ ان کے دل میں خوشی کی لہر دوڑ گئی ہے۔ایک بار انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا خان یاسر اپنے کو جماعت کے لیے بلا معاوضہ وقف کرسکتے ہیں؟ میں نے کیا جواب دیا وہ تو یاد نہیں، البتہ انھوں نے کہا تھا کہ اللہ کا دیا ہوا ہم لوگوں کے پاس بہت کچھ ہے، اگر جماعت کو ضرورت ہو تو انہیں تیار رہنا چاہیے۔

ڈاکٹر صاحب ایک باعزت اور خوش حال گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔لیکن اس کے باوجود ان کے مزاج میں تواضع اور انکسار تھا۔کبر اور تعلّی سے دور تھے، ملک وملت اور ملی اداروں سے ان کا تعلق دنیا کمانے اور اپنا گھر بنانے کے لیے نہیں تھا۔وہ اپنا خرچ کرکے دین وملت کی خدمت کو اپنے لیے باعثِ سعادت سمجھنے والوں میں تھے۔

ان کے ساتھ میرے متعدد سفر ہوئے ہیں۔ایک سفر کا ذکر اوپر آچکا ہے۔دہلی، بنگلور، ہاسن، میسور کا بھی ساتھ سفر ہوا۔ان سفروں میں معتمدِ مال شیخ منیر احمد صاحب بھی ساتھ رہے ہیں۔ہم نے دیکھا کہ وہ کس سادگی سے سفر کررہے ہیں، عام سلیپر کلاس میں سفر، اے. سی (A.c) اور فرسٹ کلاس

میں نہیں۔ جب کہ وہ اس کی اہلیت رکھتے تھے۔ شیخ منیر احمد صاحب تو ریلوے کے اونچے عہدے سے ریٹائرڈ ہوئے تھے۔ ان کے پاس فرسٹ کلاس میں سفر کے لیے ریلوے پاس (Railway pass) بھی تھا۔ یہ لوگ سفر میں اپنا سامان خود اٹھاتے، نہ قلی کرتے، نہ کسی دوسرے کو ہاتھ لگانے دیتے۔ سفر کے ساتھیوں کے ساتھ بھی ان کا رویہ بہت اچھا ہوتا۔ مجھے یاد پڑتا ہے ایک سفر میں یہ دونوں میرے ساتھ تھے، مجھ سے عمر میں بڑے، عہدے ومنصب اور خدمات میں مجھ سے بڑھ کر، شیخ منیر احمد صاحب سے میرا کسی مسئلے میں اختلاف ہوا، بحث ہوگئی اور میری آواز ذرا اونچی ہوگئی لیکن ان دونوں بزرگوں نے برا نہیں مانا۔ نہ اس وقت اور نہ بعد میں کبھی اس کا اظہار ہوا۔ انسان کیسا ہے، اس کو پہنچاننے کی ایک شکل یہ ہے کہ انسان اس کے ساتھ سفر کرے، میں نے سفر میں ان بزرگوں کو اپنے سے بہت اونچا پایا۔

ڈاکٹر خلیل احمد صاحب مہمان نواز بھی واقع ہوئے تھے۔ انھیں دوسروں کو اپنے ساتھ کھانے میں شریک کر کے بڑی خوشی ہوتی۔ بارہا راقم نے ان کے ساتھ ناشتہ کیا ہے، چائے پی ہے۔ ان ناشتوں میں بڑی بے تکلفی اور اپنائیت ٹپکتی تھی۔ ڈاکٹر صاحب اور بہ طور خاص شیخ منیر احمد صاحب کے اصرار پر میں نے بلریا گنج بازار کی مسجد کی امامت اور خطابت کی ذمہ داری قبول کی تھی جو ایک عرصہ تک چلتی رہی اور پھر جامعہ کی ضرورت کی وجہ سے اسے چھوڑنا پڑا تھا۔ اپنی ایک پوتی کو عربی پڑھانے کے لیے باصرار ڈاکٹر خلیل احمد صاحب نے خواہش کی اور مجھے ان کی خواہش کا احترام کرنا پڑا۔ جامعہ کے بعض مسائل کی طرف میں نے انھیں توجہ دلائی اور یہ توجہ دلانا بے کار نہیں ہوا۔ میرے توجہ دلائے ہوئے بعض امور پر ان بزرگوں نے شوریٰ میں بات اٹھائی اور بعض اچھے فیصلے کرائے۔

جب میں جامعہ سے آخری بار، مستقل طور سے رخصت ہو رہا تھا، جس کا اثر مجھ پر بھی تھا اور دوسرے بہت سے لوگ بھی اس سے متأثر تھے۔ طلبہ، اساتذہ، قصبہ کے لوگ، نہ جانے کتنی آنکھیں نم تھیں۔ اس موقع پر ان سے ملنے گیا۔ ان کی آواز گلوگیر تھی اور میری آواز بھی۔ گھر سے باہر وہ مجھے کچھ دور تک چھوڑنے آئے۔

ڈاکٹر صاحب بڑی پابندی سے ورزش کرتے اور چہل قدمی کرتے۔ انھوں نے طبیہ کالج علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سے تعلیم حاصل کی تھی اور کامیاب پریکٹس کرتے تھے۔ بلریا گنج کے ایک غیر مسلم نے مجھے بتایا تھا کہ میرا مرض لاعلاج تھا، ڈاکٹروں نے مایوسی ظاہر کر دی تھی لیکن ڈاکٹر خلیل احمد صاحب

کی معمولی دوااور تدبیر کے سہارے میں شفایاب ہوگیا۔

ڈاکٹر صاحب عمر کے آخری حصے میں ہومیوپیتھی کے دلدادہ ہوگئے تھے۔ڈاکٹر صاحب کے بارے میں مولانا شہباز اصلاحی صاحب نے ایک دفعہ کہا تھا کہ ڈاکٹر خلیل احمد صاحب کی تشخیص بہت اچھی ہوتی ہے۔البتہ حکیم محمد ایوب کے ہاتھ میں شفامحسوس ہوتی ہے۔

ڈاکٹر خلیل احمد صاحب خطابت کے نہیں، عمل کے آدمی تھے، وہ کام کرنا جانتے تھے۔ پوری زندگی عمل کرتے رہے اور اپنے حصے کا کام پورا کر کے اپنے رب سے جاملے۔اللہ غریق رحمت کرے اور ہمیں بھی توفیق دے کہ زندگی کی آخری سانس تک، اخلاص کے ساتھ عمل کرتے رہیں اور جو وقت بچا ہے، اسے سوکر نہ گزار دیں۔

ڈاکٹر خلیل احمدؒ: بہترین معالج اور تحریکی رفیق

ڈاکٹر تابش مہدی

۲۹ رمئی ۲۰۲۳ کی شب میں بلریا گنج (اعظم گڑھ) کی جانی پہچانی شخصیت، معالج اور تحریکی رفیق ڈاکٹر خلیل احمد (۱۹۳۱-۲۰۲۳) طویل عمر گزار کر ہمیں داغِ جدائی دے گئے۔ وہ ۱۹۳۱ میں بلریا گنج کے ایک زمین دار اور متمول گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ انھوں نے وہیں سے بنیادی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد علی گڑھ سے بی یو ایم ایس کی ڈگری حاصل کر کے اپنے وطن ہی میں علاج معالجے کے پیشے سے جڑ گئے اور بانوے (۹۲) سال کی بھرپور اور کام یاب زندگی گزار کر وہیں سے دار فانی کو کوچ کر گئے۔ جب یہ تکلیف دِہ خبر مجھے ملی تو میں ساکت سا رہ گیا۔ کافی دیر کے بعد سکوت کا سلسلہ ٹوٹا۔ پھر کتابِ ماضی کے یادگار صفحات یکے بعد دیگرے سامنے آنے لگے۔ ان کی زندگی کے وہ تمام لمحات ذہن و دل پر روشن ہونے لگے، جن میں کسی نہ کسی نوعیت سے میں بھی شامل رہا ہوں۔ میں اپنی اِس حرماں نصیبی پر اب تک متأسف ہوں کہ میں ان کی نمازِ جنازہ اور تکفین و تدفین میں شرکت کی کام یاب کوشش نہ کر سکا۔ یہ تأسف و حرماں نصیبی کا احساس دیر تک رہے گا۔

ڈاکٹر خلیل احمد کی وفات سے بلریا گنج اور اس کے مضافات کے لوگ ایک ایسے عظیم فرد سے محروم ہو گئے، جس کا سلسلہ اُس دیار کے اُن اعاظم رجال سے ملتا تھا، جن میں حکیم محمد ایوب ندوی، مولانا محمد عیسیٰ قاسمی اور مولانا ابوالبقا ندوی رحمہم اللہ کے زندہ و تابندہ نام خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ وہ ملت اسلامیہ کے ایک مخلص و ہم درد فرد تھے اور اس کی تعلیم و ترقی کے لیے ہمیشہ فکرمند اور ساعی و کوشاں رہتے تھے۔ وہ یکے از بانیانِ جامعۃ الفلاح تھے۔ وہ جامعۃ الفلاح کی تعمیر و ترقی اور اس کی تعلیمی و تربیتی اصلاح و بلندی کے لیے مسلسل سوچتے رہتے تھے۔ ہر ملنے جلنے والے سے تبادلۂ خیال کرتے رہتے تھے اور جس حد تک ممکن ہوتا تھا، متعلقہ ذمے داروں کے شانہ بہ شانہ اس کی تمام تعمیری و انتظامی

سرگرمیوں میں حصہ بھی لیتے رہتے تھے۔

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ ڈاکٹر خلیل احمد پیشے کے لحاظ سے ڈاکٹر تھے۔ گرچہ اُس دیار کے معالجین میں حکیم محمد ایوب ندوی کو شہرت و نام وری حاصل تھی، وہ اپنے مخصوص علاج اور اس سے حیرت انگیز صحت و شفایابی کی وجہ سے نہ صرف بلریا گنج یا اس کے مضافات، بلکہ دوسرے دور و نزدیک کے اضلاع میں بھی شہرت رکھتے تھے اور ان کے یہاں مریضوں کا ایک قسم کا میلا لگا رہتا تھا۔ لیکن ڈاکٹر خلیل احمد صاحب بھی اپنے ایلوپیتھی علاج کے لیے قرب و مضافات میں خاصی شہرت رکھتے تھے۔ وہ مریضوں کو بڑی توجہ سے دیکھتے تھے، ان کے ساتھ ہم دردانہ معاملہ رکھتے تھے۔ لیکن جب جامعۃ الفلاح یا تحریک وملّت کا کوئی معاملہ آجاتا تھا اور اس کے لیے وقت دینے کی بات آجاتی تھی تو وہ ہمیشہ اس کے لیے بھی تیار رہتے تھے۔ جب اور جہاں بھی جانا ہوتا تھا، بڑی یک سوئی کے ساتھ خود کو فارغ کر لیتے تھے۔ وہ جامعۃ الفلاح کے قیام کے روز اوّل ہی سے اس کی تعمیر و ترقی میں برابر کے شریک رہے۔ اس کی مختلف کمیٹیوں کے رکن رہے اور اس کے مختلف تعلیمی، تربیتی اور انتظامی عہدوں پر بھی فائز ہوتے رہے۔ جس عہدہ و منصب پر رہے اپنی صلاحیت و استعداد کی حد تک انھوں نے اس کا حق ادا کرنے کی کوشش کی۔ جہاں ضرورت سمجھی بعض دوسرے باصلاحیت لوگوں سے بھی تعاون لیا۔ اس سلسلے میں ان کے قریبی عزیز ماسٹر عبدالجلیل مرحوم خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔

ڈاکٹر صاحب وقتاً فوقتاً بعض فارغین جامعہ، خصوصاً ماضی قریب کے اُن فارغ طلبہ سے جو جامعہ سے سند عالمیت یا فضیلت لے کر کسی یونی ورسٹی میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے ہوتے تھے، جامعہ کی علمی، تعلیمی اور انتظامی صورتِ حال سے متعلق دریافت کرتے رہتے تھے۔ یہ سوال خصوصیت کے ساتھ کرتے تھے کہ آپ جامعہ سے آنے کے بعد اپنے اندر کیا تعلیمی کمی محسوس کرتے ہیں اور اِس کمی پر کس طرح قابو پایا جا سکتا ہے؟ میں نے دہلی میں متعدد بار ان کے ساتھ رہ کر کئی طلبہ سے ان کے تأثرات کو جان کر جامعہ سے متعلق ان کی تعلیمی و انتظامی کمیوں کو سدھارنے کی فکرمندی کو محسوس کیا۔

بلریا گنج جانے سے پہلے میں وہاں کی بعض شخصیات سے تو واقف تھا، مختلف حوالوں سے اُن سے خط و کتابت بھی رہی، لیکن ڈاکٹر خلیل احمد مرحوم سے میری کوئی واقفیت نہیں تھی۔ اُن سے میں اس وقت متعارف ہوا، جب ۱۹۸۶ء میں جامعۃ الفلاح سے میری وابستگی ہوئی۔ وہاں پہنچے ہوئے ابھی

مجھے چند ہی دن ہوئے تھے کہ ایک دن کسی نے بڑے شکایتی انداز میں بتایا کہ 'ابھی کچھ دیر پہلے ابتدائی شعبے میں کسی غرض سے ڈاکٹر خلیل احمد صاحب تشریف لائے ہوئے تھے، وہاں ایک مدرس کسی طالب علم کو کسی وجہ سے چھڑی سے مار رہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے بڑھ کے مدرس صاحب سے چھڑی چھین لی اور ان کے اِس رویّے پر سخت ناگواری کا اظہار کیا۔ ان صاحب نے یہ بات بڑے شکایتی انداز میں بتائی تھی۔ لیکن اِس خبر نے میرے دل میں ڈاکٹر خلیل احمد کے لیے ایک اچھی جگہ بنادی۔ اس لیے کہ میری زندگی کا اچھا خاصا وقت تعلیم و تدریس میں گزرا ہے۔ میں نے ہر عمر کے طلبہ و طالبات کو پڑھایا ہے۔ لیکن ان کو مارنے پیٹنے سے میں نے ہمیشہ پرہیز کیا ہے۔ بس ڈانٹ پھٹکار ہی سے کام لیا ہے۔ اس میں کام یاب بھی رہا ہوں۔ اس واقعے کے بعد ڈاکٹر صاحب سے جب بھی، یا جہاں بھی ملاقات ہوئی، میں نے بڑھ کے سلام و مصافحہ کیا۔ البتہ اِس شنیدہ خبر پر نہ کبھی خوشی کا اظہار کیا اور نہ اس سلسلے میں ان سے کچھ پوچھا۔ انھوں نے بھی ہمیشہ محبت و موانست کا معاملہ کیا۔ پھر ان رسمی ملاقاتوں نے گہرے تعلق اور یگانگی کی شکل اختیار کر لی۔ یہ تعلق اتنا بڑھا کہ جن دو چار رفقا سے میرے خصوصی تعلقات تھے، وہ بھی اُن کے خصوصی احباب و رفقا میں شامل ہو گئے۔ دوست کا دوست، دوست ہوتا ہے اور دوست کا دشمن، دشمن، کی کہاوت پورے طور پر صادق آئی۔ ایک دوسرے کے ہاں وقتاً فوقتاً جانے اور چائے پانی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ کسی وجہ سے شاید یہ ماحول پہلے نہیں تھا۔ اِس خوش گوار فضا سے اساتذہ جامعہ اور بعض دوسرے رفقا نے بھی اثر لیا ہوگا۔

ایک دن محترم ڈاکٹر خلیل احمد صاحب میرے جامعہ کے رہایشی کمرے میں پوچھتے پوچھتے آ گئے۔ میں اس وقت دوپہر کا کھانا کھا رہا تھا۔ کھانے میں دال اور سبزی بھی تھی، لیکن میں گڑ سے روٹی کھا رہا تھا۔ میں ان دنوں جامعہ کے کمرہ نمبر چالیس (۴۰) میں رہتا تھا۔ چالیس نمبر پہنچنے سے پہلے زینے کے پاس ہی دس نمبر پڑتا تھا۔ وہاں کچھ طلبہ کو کافی زدوکوب کے بعد مرغا بنایا گیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے میرے ہاتھ میں گڑ کی ڈلی دیکھ کر حیرت و استعجاب کا اظہار کیا، فرمایا: آپ نے تو میری ساری کوفت دور کر دی۔ میں نیچے سے بہت مکدّر ہو کر آیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب بس چند ہی منٹ بیٹھے اور فرمایا: میں اس لیے حاضر ہوا ہوں کہ میری خواہش ہے کہ میری چھوٹی بیٹی کو آپ صحیح طریقے سے قرآن مجید پڑھا دیں۔ اگر موقع رہے تو کچھ میری اصلاح بھی کر دیں۔ میں

نے فوراً آمادگی ظاہر کردی۔ ڈاکٹر صاحب نے شکریہ ادا کیا اور سلام کر کے رخصت ہو گئے۔

میں نے کم وبیش ڈھائی تین برس تک ڈاکٹر خلیل احمد کے دولت کدے پر ان کی بیٹی عزیزہ رمی، دو بھانجیوں اور ان کی پوتی عزیزہ نوزی سلمہا کو قرآنِ مجید اور اسلامیات کی بعض کتابیں پڑھائیں۔ کچھ دنوں تک خود ڈاکٹر صاحب نے بھی ابتدائی قواعد کے ساتھ قرآنِ مجید کی صحت ودرستی کی کوشش کی۔ اِس دوران انھوں نے میرے ساتھ غیر معمولی طور پر اعزاز وتکریم کا معاملہ کیا۔ پابندی کے ساتھ ناشتے کا اہتمام کیا۔ ان کی کوشش یہی رہتی تھی کہ جو چیز مجھے پسند اور مرغوب ہے وہی ناشتے میں رہے۔ دہی کا اہتمام تو وہ خصوصیت کے ساتھ کرتے تھے۔

یہ بات خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے کہ میں ڈاکٹر صاحب کے ہاں سے بچیوں کو پڑھا کے رخصت ہوتا تھا تو کچھ دیر راستے میں کھڑے ہو کر گلیوں میں کھیلنے والے بچوں کے پاس جا کر انھیں کھیل ختم کر کے مدرسے جانے کی تیاری کے لیے آمادہ کرتا تھا اور حسب ضرورت انھیں محبت وشفقت کے ساتھ کچھ تنبیہ وتلقین بھی کرتا تھا۔ میرا یہ عمل کسی طرح سے ڈاکٹر صاحب کے علم میں آ گیا۔ انھوں نے اس پر غیر معمولی خوشی ومسرت کا اظہار کیا اور اس سلسلے میں انھوں نے ایک اعزازیے کی بھی پیش کش کی۔ میں نے یہ کہہ کر اُسے قبول نہیں کیا کہ ڈاکٹر صاحب یہ کام میں محض اپنی عادت ومزاج کے لحاظ سے حسب موقع کرتا ہوں، یہ کوئی ڈیوٹی نہیں ہے۔ اس سے ڈاکٹر صاحب کی ملت کے فرزندوں کے تئیں فکرمندی اور ان کی تعلیم وتربیت کے لیے ان کے احساس ذمہ داری کو ہم محسوس کر سکتے ہیں۔ یہ وہ جذبہ خیر خواہی اور احساس وفکرمندی ہے، جو آج کے دور میں تقریباً مفقود ہے۔

ڈاکٹر صاحب میرے طریقہ تعلیم وتربیت سے خاصے متأثر تھے۔ وہ مجھ سے اکثر فرمایا کرتے تھے کہ 'آپ کو آپ کے نزدیک رہ کر ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ دور سے تو آپ بس شاعر ہی معلوم ہوتے ہیں۔' یہ محض ان کا حسنِ ظن تھا۔ اِس حسنِ ظن کا اظہار وہ اکثر اپنے ملنے والوں اور بعض اساتذہ جامعہ سے بھی کرتے رہتے تھے۔

ڈاکٹر خلیل احمد صاحب نے گرچہ صرف عصری تعلیم حاصل کی تھی۔ دینی تعلیم وہ نہیں حاصل کر سکے تھے۔ لیکن خاندان کے مخصوص ماحول اور اپنے ذوق وشوقِ مطالعہ سے انھوں نے بہت کچھ حاصل کر لیا تھا۔ ان کی دین داری، احتیاط اور رہن سہن کو دیکھ کر یہی محسوس ہوتا تھا کہ وہ دین کی خاصی

معلومات رکھتے ہیں۔ اپنے اعزہ واقربا، ملنے جلنے والوں اور جامعہ کے طلبہ میں بھی وہ وہی رنگ دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ خاندانی طور پر اس مسلک سے تعلق رکھتے تھے، جسے ہم عامل بالحدیث یا اہلِ حدیث کہتے ہیں۔ ان کے خاندان کے بعض بزرگوں کو میں نے ہمیشہ اسی مسلک پر عامل دیکھا۔ خود ڈاکٹر صاحب بھی گرچہ ظاہری طور پر اس مسلک پر نہیں تھے، لیکن ان کے عقائد اور مذہبی احساسات وہی تھے، جس کے لیے وہ مسلک جانا جاتا ہے۔ شرک و بدعت یا کتاب وسنت سے انحراف کو وہ قطعی برداشت نہیں کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک بار جب انھیں معلوم ہوا کہ جماعت اسلامی کے مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی سے وہ تفسیر شائع ہونے والی ہے، جو اہل سنت اور جمہور علما کے نزدیک قابلِ اعتبار نہیں ہے تو انھوں نے ایک رکنِ جماعت کی حیثیت سے اس وقت کے امیر جماعت حضرت مولانا ابواللیث ندوی کو بہت سخت خط لکھا اور اس کی اشاعت کے فیصلے کی مخالفت کی۔ انھوں نے یہاں تک لکھ دیا کہ اس تفسیر میں انکار حدیث کے کیڑے بُری طرح بلبلا رہے ہیں۔

جامعۃ الفلاح میں چار برس گزارنے کے بعد بوجوہ میں نے آیندہ وہاں نہ رہنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ اس کا ذکر وہاں کے بعض مخلصین سے بھی کردیا تھا۔ سالانہ تعطیل ہوئی تو میں ۲۲/مارچ ۱۹۹۰ء کو وہاں سے آگیا۔ اس زمانے میں میں مستقل طور پر دیوبند ہی میں رہتا تھا۔ دیوبند پہنچنے کے دو چار دن کے بعد میں نے نہایت غم وحزن کے ساتھ محترم ناظم جامعہ کو استعفا بھیج دیا۔ اس وقت جامعہ کے ناظم محترم مولانا صدرالدین اصلاحی رحمۃ اللہ علیہ تھے اور نائب ناظم مشفقی ومحبی ڈاکٹر خلیل احمد رحمۃ اللہ علیہ۔ میں نے اِستعفا جامعہ کے پتے پر بھیجنے کے بجائے براہ راست ناظم جامعہ محترم مولانا صدرالدین اصلاحی کو ان کے گھر کے پتے پر پھول پور ضلع اعظم گڑھ بھیج دیا۔ اپریل کی کسی تاریخ کو استعفے کی رسید اور منظوری ہم دست ہوگئی۔ ابھی میرے استعفے کو کچھ ہی دن ہوئے تھے کہ سہ روزہ اخبار دعوت دہلی کے ۱۳/مئی ۱۹۹۰ء کے شمارے میں 'ضروری اعلان' کے عنوان سے میرے خلاف ایک اشتہار شائع ہوگیا۔ اس اشتہار سے ایک بات تو یہ معلوم ہورہی تھی کہ میں (تابش مہدی) نے جامعۃ الفلاح میں بڑے پیمانے پر اسناد فروشی کی ہے اور دوسری یہ بات بھی مترشح ہورہی تھی کہ اسی اسناد فروشی کی وجہ سے مجھے جامعۃ الفلاح سے علاحدہ کردیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس وقت ناظم صاحب تو جامعہ سے بہت فاصلے پر پھول پور میں رہتے تھے۔ حسب ضرورت ہی جامعہ تشریف لاتے تھے، سارے

معاملات نائب ناظم ڈاکٹر خلیل احمد ہی دیکھتے تھے۔ یہ اشتہار بھی ان کی منظوری ہی سے آگے بڑھا ہوگا۔ اِس اشتہار کا مجھ پر شدید اثر ہوا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کیوں ہوا؟ اس کا محرک کیا اور کون رہا ہوگا؟ میں نے محترم ناظم جامعہ مولانا صدرالدین اصلاحی رحمۃ اللہ علیہ کو خط کے ذریعے سے صورتِ حال سے مطلع کیا تو انھوں نے جواباً بس اتنا لکھا کہ ''میں نے آپ کے استعفے کے ساتھ ہی اپنا استعفا بھی جامعۃ الفلاح کو بھیج دیا تھا۔ اس سلسلے میں میں کچھ نہیں کرسکتا ہوں۔'' اس اشتہار نے پورے تحریکی حلقے میں اور اس سے باہر بھی میری بہت غلط تصویر پیش کی۔ اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔ لیکن جب لوگوں کے سامنے صحیح صورت حال آئی تو بہت جلد ساری غلط فہمیاں اور بدگمانیاں ختم ہوگئیں۔ لوگوں نے بتایا کہ ڈاکٹر خلیل احمد اس صورتِ حال پر بے حد متأسف تھے۔ انھوں نے بعض لوگوں کو اس کا ذمے دار ٹھہرایا۔ کچھ دنوں کے بعد دہلی تشریف لائے تو اپنے ایک عزیز نیر صاحب کے ہاں مجھے اپنے ہم راہ لے گئے، جو بٹلا ہاؤس، جامعہ نگر نئی دہلی میں رہتے تھے۔ وہاں چائے وائے کی ضیافت کے بعد ڈاکٹر صاحب نے اشتہار کی بات چھیڑ دی اور خود کو کسی قدر بے قصور بتاتے ہوئے معافی طلب کی۔ میں نے عرض کیا: ڈاکٹر صاحب آپ میرے محسن و مشفق رہے ہیں۔ میں آپ کا مزاج شناس ہوں۔ میرا دل آپ کی طرف سے بالکل صاف ہے۔

ڈاکٹر صاحب جب بھی دہلی تشریف لاتے تھے، مجھ سے ضرور ملاقات کرتے تھے۔ میں جب بھی بلریا گنج گیا، ان سے ضرور ملاقات کی اور ان کی ضیافت سے بھی شاد کام ہوا۔ چند برس پہلے جامعۃ الفلاح کے ذمے داروں نے مجھے استاذ زائر (Visiting Professor) کے طور پر طلب کیا تو میں اپنی بعض مجبوریوں کے باوجود اس خدمت کے لیے آمادہ ہوگیا۔ ہر مہینے کے اوائل یا اواخر میں پابندی کے ساتھ کبھی ہفتے یا عشرے کے لیے میں وہاں جاتا تھا۔ کچھ اوقات تو کلاسوں میں دیتا تھا، باقی تمام اوقات مسجد میں فجر، مغرب اور عشا کے بعد مختلف جماعتوں کے منتخب طلبہ کو تجوید و قرأت پڑھاتا تھا۔ یہ سلسلہ کئی سال تک چلا۔ اعلیٰ درجات کے بعض گروپوں کو میں نے اپنی طرف سے سندیں بھی دیں۔ ڈاکٹر صاحب اس سلسلے سے بہت خوش تھے۔ فرماتے تھے: گرچہ وقت تو بہت کم ہے، پھر بھی طلبہ کو بہت کچھ مل جاتا ہے۔ ان کے اندر نمایاں فرق محسوس کیا جاتا ہے۔ اپنی اس خوشی کا اظہار انھوں نے مولانا ابوالبقا ندوی اور بعض دوسرے حضرات سے بھی کیا۔

ڈاکٹر خلیل احمد صاحب سے میری آخری ملاقات اس وقت ہوئی، جب وہ جامعۃ الفلاح کے ایک انتخابی سلسلے میں دہلی تشریف لائے ہوئے تھے۔ وہ ملاقات تو بہت مختصر رہی۔ لیکن اس کی مٹھاس اب تک باقی ہے۔ اب وہ ہم سے رخصت ہو چکے ہیں، اس دنیا میں ان سے ملاقات ممکن نہیں ہے۔ لیکن ان کی شفقتوں، محبتوں اور ضیافتوں کی یادیں تادیر باقی رہیں گی۔ دین وملت کے فروغ وارتقا کے لیے ان کی بے چینی اور فکرمندی ہمیشہ اپنی روشنی بکھیرتی رہے گی۔ سچ کہا ہے سکندر علی وجدؔ نے:

جانے والے کبھی نہیں آتے
جانے والوں کی یاد آتی ہے

آہ! ڈاکٹر خلیل احمد مرحوم

وسیم احمد بروالی

ہم سب کے مشفق اور دردمندِ قوم وملت ڈاکٹر خلیل احمد صاحب کا دنیا سے جانا یقیناً ایک بڑا سانحہ ہے۔لیکن یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ جو بھی اس روئے زمین پر آیا ہے اسے ایک دن اس دنیائے فانی کو چھوڑ کر ربِّ قدیر کے ہاں جانا ہے، كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُوالْجَلَالِ وَالْاِكْرَام۔ڈاکٹر خلیل احمد صاحب نے عمر مستعار کی ایک طویل زندگی گزاری،اس طرح گزاری کہ وہ دوسروں کے لیے ایک نمونہ بن گئی۔۱۹۵۶ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طبیہ کالج سے طب کی تعلیم حاصل کی اور پھر اسی فن کے ذریعہ خدمت خلق میں لگ گئے اور اللہ تعالیٰ نے اس پیشے میں ان کو بڑی نیک نامی اور مقبولیت عطا کی،خصوصاً امراض اطفال میں ان کی حذاقت کا بڑا شہرہ ہوا۔طبابت پیشہ ضرور رہا مگر ان کی عملی دلچسپی کا میدان تعلیم کا قوم میں فروغ تھا،اسی لیے جب وطن واپس آئے تو اپنے چند قریبی ساتھیوں کے ساتھ قصبہ بلریا گنج کے ایک قدیم مکتب پر توجہ کی اور اس کی ترقی کے لیے خود کو وقف کر دیا،حقیقت یہ ہے کہ یہی مکتب جامعۃ الفلاح بنا،اس کے بنیاد گزاروں میں ان کا نام سب سے پہلے زبان پر آتا ہے اور یہ سب جانتے ہیں کہ اس کی تعمیر وترقی میں ان کا گراں قدر حصہ ہے۔

مرحوم کی سرپرستی اس جامعہ کو اس طرح حاصل رہی کہ وہ متعدد بار ناظم ہوئے،دور اول میں ۱۹۶۳ء سے ۱۹۶۹ء تک اور پھر ۱۹۹۰ء سے ۱۹۹۳ء تک اور آخر میں ۱۹۹۶ء سے ۲۰۰۰ء تک وہ نظامت کے عہدہ کو سنبھالتے رہے اور جب جامعۃ الفلاح جیسا بڑا ادارہ ہو،اس کا کارِ نظامت اتنا آسان نہیں ہوتا ہے،لیکن انھوں نے جس حسن وخوبی سے یہ فرض انجام دیا وہ ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔جامعۃ الفلاح کے نصابِ تعلیم کی تشکیل میں بھی ان کا بنیادی اور اہم کردار رہا ہے۔ان کا یہ نظریہ تھا کہ تعلیم قدیم وجدید کا سنگم ہونی چاہیے۔وہ نوجوانوں کو تعلیم کی طرف راغب کرتے اور ان کی تعلیمی رہنمائی کرتے۔

ڈاکٹر صاحب جماعت اسلامی کے بھی ایک اہم رکن تھے اور اس حیثیت سے بھی انھوں نے جماعت کی بڑی خدمت کی، بلریا گنج میں جماعت ہی کی جانب سے یتیم بچوں کے لیے ''گلشن اطفال'' کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا گیا تو اس کی صدارت کی ذمہ داری اور تعمیر و ترقی میں انھوں نے سرگرم حصہ لیا۔

میری خوش نصیبی ہے کہ ڈاکٹر صاحب سے میرا تعلق قائم ہوا اور یہ وقت کے ساتھ مضبوط تر ہوتا گیا، مجھے ان کی قربت کی نعمت ملی، وہ میرے لیے نہایت مشفق اور کرم فرما تھے، یہی وجہ بنی کہ آج چند ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں ان کو یاد کرنے اور ان کے اعمال حسنہ کا تذکرہ کرنے کی توفیق ملی۔

حقیقت یہ ہے کہ میں نے ان کی زندگی کا بغور مشاہدہ کیا، ایک واقعہ کا ذکر یہاں مناسب ہے۔ میں کئی سالوں سے لکھنؤ میں مقیم ہوں، ڈاکٹر صاحب کا یہاں آنا جانا لگا رہتا تھا۔ میرے پاس آئے تو مجھے دیکھ کر فرمایا کہ ''وسیم کیا بات ہے طبیعت تو ٹھیک ہے؟ بہت پریشان نظر آرہے ہو''۔ میں نے کہا ٹھیک ہے لیکن ان کا اضطراب بڑھتا گیا اور کہا ضرور کوئی بات ہے، انھوں نے اپنے جیب خاص سے کچھ رقم عنایت کی اور کہا اس کو رکھ لو۔ یہ ان کی بے پناہ محبت و شفقت کی ایک ناقابل فراموش یاد ہے۔ وہ تو رخصت ہوئے اور پھر اس دنیا سے بھی رخصت ہو گئے لیکن وہ دل سے کبھی الگ نہیں ہوں گے۔ ان کا اس دنیا سے جانا ذاتی طور پر میرا اپنا غم ہے ؎ مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ تجھے

ڈاکٹر صاحب شہرت کے طالب کبھی نہیں رہے ان میں عجز و انکسار کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ ان کی شخصیت اس پھول کی طرح تھی جو خاموشی سے اپنی خوشبو بکھیرتا ہے۔ انھوں نے اپنی زندگی کا بیش تر حصہ جامعہ کی تعمیر و ترقی کے لیے وقف کر دیا تھا، لیکن کبھی بھی اپنی خدمات کا تذکرہ کرنا گوارا نہ کیا، سچ بات یہ ہے کہ وہ اپنے میدان عمل میں سرگرم رہے اور یہ سب ملت کے لیے ان کی فکرمندی کی وجہ سے تھا۔ اسی بنا پر وہ کئی اداروں سے جڑے ہوئے تھے، جیسے شبلی کالج کی عاملہ کے وہ بڑے مؤقر اور معزز رکن تھے۔

بلریا گنج میں ''گلشن اطفال'' کا ذکر کر چکا ہوں، جس کے بانی تھے اور آخر تک اس کی سرپرستی کرتے رہے۔ اسی طرح جماعت اسلامی ہند کے قدیم ترین ارکان میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ مختصر یہ کہ ان کی خدمات غیر معمولی تھیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی خدمات جلیلہ کو شرف قبولیت سے نوازے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین!

ہمارے ڈاکٹر صاحب!

اطہر ریحان فلاحی

جامعۃ الفلاح کا خیال آتے ہی بلریا گنج کی جن چند شخصیات کے نام ذہن کے کینوس پر ابھر کر سامنے آجاتے ہیں ان میں حکیم محمد ایوب صاحب، شیخ منیر صاحب، حاجی متین صاحب، مولوی محمد عیسیٰ صاحب، منشی محمد انور صاحب کے علاوہ ایک نہایت معتبر نام ڈاکٹر خلیل احمد صاحب کا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان مؤسسین فلاح کی مخلصانہ خدمات کو قبول فرما کر جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔

گذشتہ ۴ رمئی کو ڈاکٹر صاحب کی ملاقات اور عیادت کے لیے بلریا گنج حاضر ہوا تھا۔ دیر تک ملاقات رہی۔ چائے ناشتہ کے بعد لنچ کا بھی انتظام کرایا اور پھر اپنے بیٹے برادرم خلیق الرحمٰن کے ساتھ اپنی نوتعمیر مسجد اور لائبریری دیکھنے کے لیے بھیجا۔ اس سفر کا زیادہ وقت ڈاکٹر صاحب کے ساتھ گذرا، گرچہ اس بار پہلے جیسی گرم جوشی کے باوجود گفتگو میں تسلسل کی کمی تھی، لہٰذا دم رخصت ایک موہوم اندیشہ بار بار پریشان کرتا رہا، لیکن یہ آخری ملاقات ہو جائے گی اس کا یقین نہیں تھا۔ آخر ۲۸ اور ۲۹ر مئی کی درمیانی شب کو فلاح کا روح رواں، اس کا مؤسس، دینی تعلیم کے ساتھ عصری تعلیم کی پرزور وکالت کرنے والا ماہر تعلیم اور پیکر اخلاص و مروت اپنے لگائے ہوئے پودے کو تناور درخت کی شکل میں دیکھ کر اپنے پیچھے بھرا پرا خاندان چھوڑ ہمیشہ کے لیے دار فانی سے رخصت ہو گیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون

زمانۂ طالب علمی میں میرا ڈاکٹر صاحب سے کوئی خاص تعلق نہیں تھا، البتہ کالی شیروانی میں ملبوس سائیکل کے ساتھ ان کی وضع دار شخصیت سے یہ تأثر ضرور پیدا ہوتا کہ یہ جامعہ کے ناظم، کامیاب معالج اور مسلم یونیورسٹی کے فرزند ہیں۔ باقاعدہ تعارف اس وقت ہوا جب استاد محترم مولانا شبیر احمد اصلاحی کو پھوڑے کے آپریشن کے سلسلے میں ڈاکٹر صاحب کی کلینک پر ڈاکٹر اشتیاق صاحب کے پاس لے جانا پڑا۔ آپریشن کے وقت نشتر لگتے ہی میں غشی کھا کر گر پڑا، ہوش آیا تو ڈاکٹر صاحب نے دریافت

حال کے بعد تعارف کرایا تو پتہ چلا کہ میرے ماموں زاد بھائی ڈاکٹر سفیان صاحب (پوٹریا) ڈاکٹر صاحب کے کلاس فیلو ہیں۔ اس تعلق سے کبھی کبھی مطب پر دوا لینے چلا جایا کرتا تھا۔

عربی ششم کے درمیان سے مجھے ندوہ جانے کا حکم ہو گیا۔ وہاں سے مدرسہ بورڈ کی عالم کی سرٹیفکیٹ کی بنیاد پر بی یو ایم ایس میں داخلہ ہوا۔ اس طرح مسلم یونیورسٹی سے وابستہ ہونے کی دیرینہ تمنا اور شوق پورا ہوا۔ میرے ساتھ حمد اللہ فراہی بھی تھے یوں پہلی بار دو فلاحیوں (ایک مکمل اور دوسرا ادھورا) کا علی گڑھ میں داخلہ ہوا جس کا قلق اور احساس برابر رہا کہ مدارس کے فارغین معیاری تعلیم کے باوجود عصری درسگاہوں میں داخلے کے مجاز نہیں ہوتے۔ لہٰذا دل میں ٹھان لیا کہ فلاح کی سند کو ضرور منظور کرایا جائے۔ اس کا تذکرہ منشی سہیل صاحب سے کیا اور ان کے ذریعہ تجویز ڈاکٹر خلیل صاحب کو بھیجی گئی جس کو ڈاکٹر صاحب نے عاملہ سے پاس کرا کے ضروری کاغذات کے ساتھ نگراں جنید صاحب اور مولانا مطیع اللہ صاحب فلاحی کو علی گڑھ بھیجا اور کارروائی کے لیے مجھے پورا اختیار دیا۔ پھر کیا تھا اللہ تعالیٰ کا نام لے کر کام شروع کر دیا۔

ان دنوں علی گڑھ میں فلاح کو جاننے والے ڈاکٹر فضل الرحمٰن فریدی، ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی، ڈاکٹر حمید اللہ اور ڈاکٹر اشتیاق احمد ظلی صاحبان ہی تھے۔ سب سے رابطہ کیا مگر کسی نے حوصلہ افزائی نہیں کی، بلکہ نجات اللہ صدیقی صاحب نے تو یہ کہہ کر مزید مایوس کر دیا کہ ندوہ وغیرہ کا داخلہ گریجویشن سطح پر نہیں ہوتا تو فلاح کا کیسے ہو جائے گا۔ بہرحال خاموشی سے تین سالوں تک محنت ہوتی رہی اور محترم ڈاکٹر خلیل احمد صاحب کی مکمل تائید اور ہر طرح سے سپورٹ کی بدولت کوشش بار آور ہوئی۔

اس سلسلے میں جن لوگوں کے بے لوث سپورٹ کو فراموش نہیں کیا جا سکتا اور جو پوری فلاحی برادری کے شکریہ کے مستحق ہیں ان میں سرفہرست یونیورسٹی رجسٹرار جمال صاحب، ڈین فیکلٹی آف آرٹس اینڈ سوشل سائنس پروفیسر انوار الحق حقی صاحب، پرووسٹ سرسید ہال پروفیسر حسام الدین فاروقی صاحب، پروفیسر کمال الدین ہمدانی طبیہ کالج اور صدر اسٹوڈنٹس یونین برادر مکرم زیڈ کے فیضان صاحب جنھوں نے اس سعی پیہم میں ہمارا ساتھ دیا۔

آج جامعۃ الفلاح کو جو شہرت اور عروج حاصل ہوا ہے وہ ڈاکٹر صاحب کی دور اندیشی اور عصری تعلیمی درسگاہوں سے فلاح کی ہم آہنگی اور ملک و بیرون ملک کی جامعات سے الحاق کے دور

اندیشانہ فیصلے کی بدولت ہے۔جس کا سہرا بڑی حدتک ڈاکٹر صاحب کو جاتا ہے۔

مولانا ابواللیث اصلاحی کے دورنظامت میں ڈاکٹر صاحب کی سفارش پر سب سے سینئر فلاحی ابوالمکارم صاحب اور ناچیز کوفلاح کی انتظامیہ کا ممبر بنایا گیا، جبکہ بیرون ملک ملازمت کے سبب دیر تک خدمت نہیں کرسکا اور مستعفی ہوگیا۔

۱۹۸۰ء میں جب میں اعظم گڑھ سول اسپتال میں زیر ٹریننگ تھا اس دوران انجمن طلبہ قدیم کا پہلا کنونشن ہونا طے پایا جس کی ذمہ داری مجھ پر ڈال دی گئی، اور ڈاکٹر ابرار فلاحی چاند پٹی وانصار احمد فلاحی بلریا گنج کو معاون کنوینز بنایا گیا۔جلسہ کی تیاری بڑے پیمانہ پر شروع کردی گئی۔جس کمرہ میں میرا قیام ہوا کرتا تھا اس پر دفتر انجمن طلبہ قدیم کی تختی لگوادی گئی۔ڈاکٹر صاحب کو کسی نے سمجھایا کہ اس سے یونین بن جائے گی اور یہ فلاح کے مفاد میں نہیں ہے۔یہ بات ناظم صاحب کو بھی پہنچادی گئی۔ڈاکٹر صاحب نے منع کروادیا جس کے جواب میں میں نے کہلوایا کہ یہ جامعہ کے حق میں نہیں ہے۔آفس تو ہم لوگ کہیں باہر بنالیں گے لیکن ٹکراؤ ہمیشہ کے لیے ہوجائے گا۔پھر کوئی رکاوٹ نہیں پیدا کی گئی اور کنونشن بہت کامیاب رہا۔تین نشستوں میں اجلاس ہوا جس میں پہلی بار مولانا سعید احمد اکبرآبادی، ڈاکٹر احمد اللہ صدیقی، صباح الدین عبدالرحمٰن، مولانا مجیب اللہ ندوی، ڈاکٹر شبنم سبحانی، جناب حفیظ میرٹھی، اور جناب مائل خیرآبادی غیرہ نے شرکت کی۔مولانا جلیل احسن ندوی نے درس قرآن دیا۔فجر کی نماز کے بعد ناظم صاحب نے تمام فلاحیوں کو چائے پر بلایا اور بڑی مشفقانہ وحوصلہ افزا تقریر کی اور اپنی غلط فہمی پر اظہار افسوس کیا۔ساتھ ہی کنونشن کے کامیاب انعقاد کے لیے مبارکباد دی۔بعد میں لوگوں نے دیکھا اور جو موجود ہیں وہ دیکھ رہے ہیں کہ مادر علمی کی تعمیر وترقی میں طلبہ قدیم کا کیسا مثبت رول رہا ہے۔ڈاکٹر صاحب کو بھی اس کا احساس ہوا اور فیصلہ کو غلط فہمی پر مبنی بتا کر معذرت کی۔

سعودی عرب کی ملازمت ترک کرکے جگدیش پور کے نواح میں ایک معیاری تعلیمی ادارہ کے قیام کے منصوبہ کے ساتھ ہندوستان واپس آیا تو ڈاکٹر صاحب کو اس پلان سے آگاہ کیا، تو فوراً حاجی متین صاحب کے ساتھ مجوزہ زمین اور علاقہ کا ماحول دیکھنے جگدیش پور تشریف لائے اور حوصلہ افزائی کرتے ہوئے فرمایا کام بہت مشکل ہے مگر تم کرلوگے۔

اس موقع پر حاجی متین صاحب نے انتظامیہ کی میٹنگ میں مدعوخصوصی کی حیثیت سے شرکت

کا لیٹر بھی دیا مگر کالج کی ابتدائی تاسیسی مصروفیات کی وجہ سے میں نے معذرت کر لی۔ پھر اس قدر مصروف ہوا کہ سالوں پیچھے مڑ کر دیکھنے کا موقع نہ ملا۔ جب کبھی فلاح جانا ہوتا تو کوشش یہی رہتی کہ گھر جا کر ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کروں، اگر کبھی تاخیر ہوتی اور انھیں میری حاضری کا علم ہو جاتا تو خود مہمان خانے آ کر شرمندہ کر دیتے۔ یہ ان کا بڑا پن تھا۔

علی گڑھ قیام کے دوران دو بار مجھے ساتھ لے کر جودھپور طبیہ کالج اور جے پور طبیہ کالج دیکھنے گئے۔ سفر میں مثالی کردار کا مظاہرہ کرتے اور اپنے سے زیادہ میرا خیال رکھتے۔ سفر میں بھی نمازوں کا پورا اہتمام فرماتے۔ دہلی تشریف لاتے تو گھر ضرور آتے خاص کر اگر میرے دہلی میں ہونے کی اطلاع ہوتی۔

اس جولائی میں فری کلینک کے افتتاح کے لیے خاص طور سے ڈاکٹر صاحب کو مدعو کرنے کا پختہ ارادہ تھا کہ ان کے نام کا ایک یادگاری پتھر ہدیٰ میں بھی نصب ہو جاتا مگر شاید قدرت کو ڈاکٹر صاحب کا فلاح سے باہر کسی اور ادارہ کی یادگار بننا منظور نہ تھا، افسوس کہ اب جب کلینک افتتاح کے لیے تیار ہے تو ڈاکٹر صاحب ہی نہ رہے۔

ڈاکٹر صاحب عزم کے پختہ، خاموش طبع، ملنسار، کفایت شعار، سادگی پسند اور علم کے قدر دان تھے۔ ایک بار گھر رساول کھلانے لے گئے۔ رساول اور موٹی بالائی کے ساتھ بے حد لطف آیا، مگر آخر میں یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ کھانے کے بعد پیالے کو دھو کر پیا۔ آخر میں بطور خراج عقیدت قتیل شفائی کے دو شعر نذر کرتا ہوں:

اس ایک شخص میں تھیں دل ربائیاں کیا کیا
ہزار لوگ ملیں گے مگر کہاں وہ شخص
قتیل کیسے بھلائیں ہم اہل درد اسے
دلوں میں چھوڑ گیا سب کے اک نشاں وہ شخص

تعلیم کے شیدائی: ڈاکٹر خلیل احمدؒ کی یاد میں

ڈاکٹر محی الدین غازی

بہت سے لوگ اپنی پوری زندگی ذاتی اور خانگی الجھنوں میں گزار دیتے ہیں۔ ان کی ساری فکریں خود ان کے گرد گھوم رہی ہوتی ہیں۔ سماج کو سدھارنے اور دنیا کو خوبصورت بنانے میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوتا ہے۔

بہت سے لوگ ایسی دنیاؤں کی فکریں دل میں پالے رہتے ہیں جہاں ان کی کچھ نہیں چلتی ہے۔ ان کی زندگی بڑی بڑی فکروں سے بھری ہوتی ہے، لیکن کسی کوشش سے خالی ہوتی ہے۔ وہ دنیا میں پھیلے بگاڑ کا شکوہ تو بہت کرتے ہیں لیکن بگاڑ دور کرنے میں کوئی رول ادا نہیں کرتے ہیں۔

کم لوگ ہوتے ہیں جو اپنی ذات سے اوپر اٹھ کر اپنے قریب کی اس دنیا کے بارے میں سوچتے اور فکر کرتے ہیں جہاں وہ کچھ کر سکتے ہیں۔ ایسے لوگ صرف سوچتے نہیں ہیں بلکہ بہت کچھ کر دکھاتے ہیں۔ کیوں کہ وہ اپنے لیے ایسا دائرہ کار منتخب کرتے ہیں جہاں وہ بہت کچھ کرنے کی پوزیشن میں ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر خلیل احمد مرحوم نے اپنی پوری زندگی اپنے دائرہ اثر میں سوچتے اور کرتے ہوئے گزاری۔ اس پہلو سے وہ اپنے بہت سے معاصرین میں نمایاں اور ممتاز تھے۔

وہ عین نوجوانی میں جامعۃ الفلاح کی مجلس انتظامیہ میں ہی نہیں بلکہ انتظام میں شامل ہو گئے تھے۔ بہت سے لوگوں کی آخری معراجِ آرزو یہ ہوتی ہے کہ وہ کسی مجلس کے رکن بن جائیں، خواہ کچھ کریں یا نہ کریں۔ ڈاکٹر صاحب جامعہ کے انتظام کا فعال حصہ بنے۔ وہ کبھی ناظم رہے اور کبھی نہیں رہے مگر جامعۃ الفلاح کی ترقی کے لیے سرگرم ہمیشہ رہے۔

بعد ازیں ڈاکٹر صاحب اعظم گڑھ شبلی کالج کی انتظامیہ اور عاملہ میں بھی شامل ہوئے، وہاں

بھی وہ سرگرم رہے اور ہر طرح کا عملی تعاون پیش کرتے رہے۔

بڑھاپے میں کچھ اور کرنے کا خیال آیا تو گلشن اطفال (یتیم خانے) کی داغ بیل ڈالی اور صبح تا شام اس کے انتظام وانصرام میں مشغول ہو گئے۔

قصبے کے مشرق میں گلشن اطفال قائم کیا تو قصبے کے مغرب میں ایک مسجد بنانے کی کامیاب سعی کی۔ دونوں جگہ محلے کے بچوں کی تعلیم کا انتظام کیا۔

ڈاکٹر صاحب کو تعلیمی منصوبے بہت پسند تھے۔ ایک زمانے میں مجھے خیال آیا کہ ایک اعلیٰ تعلیمی معیار کا اقامتی اسکول قائم کیا جائے۔ ڈاکٹر صاحب کو معلوم ہوا تو اس خیال کو اپنے دل میں بٹھالیا۔ اس کے بعد جب ملاقات ہوتی اسے یاد دلاتے، ہمت بڑھاتے اور اپنی طرف سے ہر طرح کے تعاون کا یقین دلاتے۔ وہ خیال کسی وجہ سے میرے دل سے نکل گیا لیکن ان کے دل میں جاگزیں رہا۔

ڈاکٹر صاحب کو ہر وہ نوجوان محبوب ہوجاتا جو تعلیمی میدان میں کوئی بڑی پیش قدمی انجام دیتا۔ اس کا وہ ہر مجلس میں ذکر کرتے۔

قصبے کے تعلیمی ماحول کو لے کر وہ بہت فکرمند رہتے، وہ شکایت کرتے کہ بچوں میں علم کی طلب نہیں نظر آتی ہے، اسکول سے آتے ہی وہ بستہ پھینک کر فضولیات میں مصروف ہوجاتے ہیں۔ وہ بچوں سے مل کر انھیں سمجھایا بھی کرتے تھے۔ دور رہنے والے اپنے بعض متعلقین کے بچوں اور بچیوں کو جامعۃ الفلاح میں تعلیم حاصل کرنے پر ابھارا اور رہنے کے لیے اپنے گھر میں جگہ دی۔ کئی یتیم بچیوں کو اپنے گھر میں رکھا، ان کو اچھی تعلیم دلائی اور احسن طریقے سے ان کی شادی کرائی۔

خلاصہ یہ ہے کہ اپنے قریبی ماحول کو بہتر بنانے کی کوشش کرتے ہوئے انھوں نے خاصی طویل اور بھرپور زندگی گزاری۔ شاید ان کی زندگی کا کوئی دن بے کار نہیں گزرا۔ جب موقع ملا کچھ کام کیا، اور جب فرصت ملی تو کاموں کے بارے میں بات کی۔

اللہ تعالیٰ ڈاکٹر خلیل احمد صاحب کی کوششوں اور خدمات کو قبول فرمائے اور ہمارے سماجوں میں ایسے بہت سے خیرخواہوں کو وجود بخشے جو اپنے ذاتی فائدوں سے زیادہ پورے سماج کی بھلائی کے لیے فکرمند اور کوشاں رہتے ہیں۔

جس رخ سے بھی پڑھیں گے انھیں جان جائیں گے

حافظ دانش فلاحی

کچھ لوگوں پر اللہ بڑا مہربان ہوتا ہے، ان کو عزت، شہرت، ذہانت اور تعمیری سوچ سے نوازتا ہے۔ ان کا ہر کام، کمالِ فن ہوتا ہے۔ وہ جس مٹی کو چھوتے ہیں، سونا بنا دیتے ہیں۔ ان لوگوں کے دشمن بہت کم اور دوست زیادہ ہوتے ہیں، کیوں کہ، دشمن کو دوست بنانے کا فن اِن لوگوں کو خوب آتا ہے۔ ان کی سرشت میں کچھ کر گزرنے کا عنصر شامل ہوتا ہے۔ بے پناہ صلاحیتوں اور ہر طرح کے دنیاوی آرام کے باوجود، ان میں تکبر کا شائبہ تک نہیں ہوتا اور منکسر المزاجی سے یہ لوگوں کے دلوں پر راج کرتے ہیں۔ ڈاکٹر خلیل احمد صاحب کا شمار ایسے ہی لوگوں میں ہوتا ہے۔

مرحوم و مغفور ڈاکٹر خلیل احمد صاحب کی تابناک زندگی کے ہمہ جہت پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کے لیے باقاعدہ اکیڈمک طرز پر کام کی ضرورت ہے۔ اس مختصر سی تحریر میں اس کا احاطہ کرنا میرے لیے ممکن نہیں ہے۔

موجودہ زمانے میں جب کہ وارڈ کی معمولی سی ممبری سے لے کر اداروں کی نظامت تک ذاتی شخصیت نکھارنے کے بیش قیمت مواقع تسلیم کیے جاتے ہیں، عہدوں کو اپنا قد اونچا کرنے کا ذریعہ سمجھنے والوں کے درمیان ڈاکٹر خلیل صاحب ایک گوہر نایاب تھے۔ انھوں نے ہمیشہ منصب کو ایک بوجھ بھری ذمہ داری سمجھ کر سنبھالا۔ نہ جانے کتنے بدنصیب ہیں وہ لوگ جو ذمہ داری کے حصول کے لیے جوڑ توڑ اور سازشوں کے تانے بانے بنتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم و مغفور کی ہمہ جہت زندگی کے مختلف گوشوں میں سے یہ ایک گوشہ مجھے سب سے زیادہ روشن اور تابناک نظر آتا ہے۔

میں نے جامعۃ الفلاح سے فراغت کے بعد دعوتی تربیت کے لیے اسلامی اکیڈمی میں داخلہ لیا۔ کورس کی تکمیل کے بعد، اکیڈمی نے مجھے اعظم گڑھ کے اطراف میں دعوتی ذمہ داری سپرد کی اور میں نے جامعۃ الفلاح میں دعوہ سینٹر کو مرکز بنا کر کام کی شروعات کی، وہیں میری ڈاکٹر صاحب مرحوم سے

پہلی ملاقات ہوئی۔ انھوں نے میرے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا کہ نصیر پور سے زرخیزی نکل رہی ہے۔ ان کے شفقت بھرے ہاتھ کا لمس میں نے ہمیشہ محسوس کیا۔ پھر وقتاً فوقتاً وہ میرے دعوتی کام کی تفصیل بھی لیتے رہتے۔ بعض نامعلوم وجوہات کی وجہ سے جب ذمہ داران جامعہ نے دعوہ سینٹر کے دروازے بند کر دیے، اس وقت ہمارے سامنے کوئی راستہ نہیں تھا۔ ایسے میں ڈاکٹر صاحب کا مشورہ ہمارے لیے نعمت ثابت ہوا۔ اور ہم نے شانتی سندیش سینٹر کے نام سے ایک دعوتی ادارہ قائم کیا۔ اس ادارے کے قیام، اس کے طریقہ کار اور اس راہ کی مشکلات کا مقابلہ کرنے کے لیے سب سے زیادہ جن لوگوں کی رہنمائی رہی ان میں اہم ترین نام ڈاکٹر خلیل احمد صاحب کا ہے۔

دعوتی کتب کی فراہمی ہمارے لیے ایک مسئلہ تھی، اچھی خاصی رقم کی ضرورت تھی۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر صاحب نے بھرپور مدد کی۔ ہماری دعوتی سرگرمیوں کو انتہائی انہماک سے سنتے، ایک بار بھگت پور میلے میں لگائے گئے دعوتی کیمپ کی روداد سن کر ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور رندھی ہوئی آواز میں صرف اتنا کہا کہ ان شاءاللہ تم لوگوں کی اس نیکی میں اللہ مجھے بھی شامل کرے گا اور کچھ نیکیاں مجھے بھی مل جائیں گی۔

ہندتوا وادی تنظیموں کی طرف سے جب کچھ اعتراضات آنے لگے تو اس وقت بھی ڈاکٹر صاحب نے مشکلات سے نکلنے کی راہ پیدا کی۔ اس وقت یہ احساس ہوا کہ ڈاکٹر صاحب آر ایس ایس سے جڑے افراد کے درمیان اپنی ایک مضبوط پہچان اور شناخت رکھتے ہیں اور وہ لوگ بھی ڈاکٹر صاحب کو انتہائی ادب واحترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

نومسلموں کے مسائل کو حل کرنے میں ڈاکٹر صاحب کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ ان کی ہر طرح کی مالی واخلاقی مدد کرنا ڈاکٹر صاحب کے فرض منصبی میں شامل تھا۔ ایجنسیوں کے لوگوں سے کس طرح معاملات طے کیے جائیں اور ان کے سامنے بغیر کسی لاگ لپیٹ کے اپنی سرگرمیوں کو واضح انداز میں پیش کرنے کا حوصلہ ڈاکٹر صاحب ہی کی تربیت کا نتیجہ تھا۔

نینی جور میں غیر مسلم بھائیوں کا ایک بڑا میلہ لگتا ہے۔ اس میلے میں دعوتی اسٹال لگانے کے لیے بہت کوشش کی گئی لیکن کامیابی نہ مل سکی۔ ڈاکٹر صاحب سے تذکرہ کیا گیا، انھوں نے وہیں کے رہنے والے ایک ٹھاکر کا نام لے کر ان سے ملنے کے لیے کہا۔ جب ہم نے ڈاکٹر صاحب کے حوالے

سے گفتگو کی تو نہ صرف یہ کہ انھوں نے میلے میں اسٹال لگوانے میں ہماری بھرپور مدد کی بلکہ رات ۱۱ بجے تک اسٹال کے باہر لاٹھی لے کر حفاظت کی غرض سے کھڑے بھی رہے۔

میں ان کے محلّہ کی جامع مسجد کا خطیب ہوں، جب تک ڈاکٹر صاحب نماز جمعہ کے لیے یہاں آتے رہے ہمیشہ اپنے مشوروں اور دعاؤں سے نوازتے رہتے۔ خاکساری کا عالم یہ تھا کہ میں جب خطبے کو مفید تر بنانے کے لیے ان کی رائے مانگتا تو کہتے کہ میں تو خود تمہارے خطبے سے سیکھتا ہوں بھلا میں کیا سکھا سکتا ہوں۔

البتہ ایک بات ہمیشہ کہتے کہ یہ منبر رسول ہے، اس کا حق ہے کہ حق بات کہی جائے، اور خطبہ ہمیشہ عوامی ہونا چاہیے نہ کہ اپنی علمی دھاک بٹھانے کا ذریعہ۔

یوں ڈاکٹر صاحب مرحوم ومغفور کا شمار میرے ان اساتذہ میں ہوتا ہے جن سے میں نے کتابی دنیا سے نکل کر عملی زندگی میں کچھ کرنے کا سلیقہ سیکھا۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم سے وہ کچھ سیکھا جو عملی زندگی میں مہمیز کا کام کرتا ہے، میرے پاس ان کے لیے صرف دعائیں ہیں۔

رب کریم ہماری دعوتی سرگرمیوں کو ان کے حق میں صدقہ جاریہ بنا دے، ان کی قبر کو نور سے بھر دے۔ آمین

آہ! ڈاکٹر خلیل احمد صاحب مرحوم

اطہر احسن فلاحی

علی گڑھ میں صبح فجر بعد یہ افسوسناک اطلاع ملی کہ محترم جناب ڈاکٹر خلیل احمد صاحب مرحوم سابق ناظم جامعۃ الفلاح کا رات ایک بجے کے آس پاس انتقال ہوگیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

مرحوم جامعۃ الفلاح کے مؤسسین میں تھے۔ جامعہ کی تعمیر وترقی میں ان کا رول ناقابل فراموش ہے۔ وہ تحریک اسلامی کے بھی ایک جانباز سپاہی تھے۔ مختلف فلاحی ورفاہی اداروں سے بھی ان کی وابستگی تھی، اوران کی تعمیر وترقی کے لیے بھی وہ کوشاں رہتے تھے۔

مرحوم سے دوران طالب علمی ہی میرے اچھے مراسم تھے اوران سے بھرپور استفادہ کا موقع بھی ملا۔ جامعہ سے فراغت ۱۹۸۵ء کے بعد جب بھی میں مادر علمی آتا تو ان سے ضرور ملاقات ہوتی اور وہ ایک بیٹے کی حیثیت سے میری نہ صرف رہنمائی فرماتے تھے، بلکہ بہترین ضیافت کا اہتمام بھی کرتے تھے۔ ان کی خصوصی ہدایت تھی کہ میں جب بھی بلریا گنج آؤں تو قیام ان کے دولت خانہ پر ہی رہے۔ لہٰذا آخری وقت تک میں نے اس ہدایت پر عمل کیا۔ میری ان سے آخری ملاقات ۱۸/ مارچ ۲۰۲۳ء کو صبح بارہ بجے ہوئی تھی۔ ان کے اہل خانہ بھی مجھ سے اور میری فیملی سے بخوبی واقف تھے۔ اس لیے مجھے کبھی اجنبیت کا احساس نہیں ہوا۔ مختلف موضوعات بشمول جامعہ وتحریک کے تعلق سے کھل کر گفتگو ہوتی تھی اور مخلصانہ انداز میں وہ جامعہ وتحریک میں درآئی خرابیوں پر اپنی تشویش کا کھل کر اظہار بھی کرتے تھے۔ ۱۸/ مارچ کو جو گفتگو جامعہ کے تعلق سے ہوئی اس وقت میں نے ان کو پہلی مرتبہ بے بس پایا۔ اوران کا یہ احساس سامنے آیا کہ ’’گو کہ حالات وواقعات سے میں تشویش میں مبتلا ہوں، پھر بھی اللہ سے دعا گو ہوں کہ حالات معمول پر آجائیں اور جامعہ تعمیر وترقی کی راہ پر گامزن ہو۔‘‘

اللہ تعالی مرحوم کی گراں قدر خدمات کو قبول فرمائے، جنت الفردوس میں اعلی مقام عطا فرمائے، اوراہل خانہ واعزہ واقارب کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین

ڈاکٹر خلیل احمدؒ: میرے دادا، میرے دوست

ڈاکٹر خان یاسر

انتہائی مصروفیت کے ساتھ اتوار کا دن گزار کر میں بستر پر دراز ہوگیا تھا۔ تاریخ، گریگورین تقویم کے مطابق ۲۸ مئی سے گزر کر ۲۹ ویں کی سرحدوں میں داخل ہوچکی تھی۔ ایک بج کر بمشکل دس سے بیس منٹ ہوئے ہوں گے کہ رات کے پردۂ خاموشی کو موبائل کی تابڑ توڑ گھنٹیوں نے چاک کر دیا۔ فون گھر سے تھا۔ دوسری طرف امی تھیں۔ بول نہیں رہی تھیں، رو رہی تھیں۔ میرے کیا ہوا؟ کیا ہوگیا؟ خدارا کچھ بتائیں... کے بیچ سسکیوں کے درمیان امی نے الفاظ بہت سے ادا کیے لیکن سوائے دو تین مرتبہ ''دادا'' کے کچھ اور بہت صاف سنائی نہیں دیا... کیا کچھ اور سننے کی ضرورت بھی تھی؟ دیر رات کا غیر متوقع فون اور سسکیوں کے درمیان ''دادا''... سب کچھ نہ سن کر بھی میں جان گیا کہ دادا زندگی سے بھرپور اپنی مہلت عمر گزار کر خوش و خرم اللہ کے دربار میں حاضر ہوگئے ہیں۔ اب یاد نہیں کہ فون میں نے کٹ کیا یا امی نے۔ لیکن گھر سے لاسلکی رابطے کے انقطاع کے ساتھ ہی ذہن کے غیر مرئی تار دادا کی یادوں سے جڑ گئے۔ پہلا خیال یہی آیا کہ بڑھاپے کی کمزوری کو ایک طرف رکھ دیں تو دادا کی صحت میں ماشاءاللہ کسی قسم کا مسئلہ نہ تھا؛ کوئی تحریک اسلامی پر فریفتگی یا جامعۃ الفلاح سے عشق کو مرض کہے تو کہے لیکن عرف عام میں جن چیزوں پر مرض کا اطلاق ہوسکتا ہے وہ دادا کی ذات میں ڈھونڈے سے نہیں مل سکتی تھیں۔ لہٰذا دل کی فریاد پر دماغ نے کانوں کے سنے کو کافی سمجھنے سے انکار کر دیا۔ اس کشمکش میں میں نے پھر گھر فون ملایا کہ کیا پتہ فون ''طبیعت خراب ہوگئی ہے'' کے لیے آیا ہو اور میں دور دراز کے اندیشوں میں ناحق گرفتار ہوگیا ہوں۔ لیکن غم کے ڈوبے کو تنکے کا یہ سہارا بھی نہ ملا۔ اس بار فون پر ابی تھے۔ دل میں اک قیامت کے ساتھ ضبط کا پیکر بن کر مجھے بتا رہے تھے کہ اس بار اندیشہ ہی صحیح ہے اور امید غلط۔ انہی سے پتہ چلا کہ دادا زندگی کی آخری شام تک بالکل اطمینان سے ہنستے مسکراتے اور باتیں

کرتے رہے، پھر رات کھانے کے بعد بستر پر آرام سے لیٹے، تقریباً ساڑھے بارہ بجے اچانک اٹھ بیٹھے اور پھر کچھ ہی دیر میں روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ آہ... مالک کی پکار پر عارضی زندگی کے چولے کو اُتار پھینکنے اور موت کا احرام پہن کر فوراً لبیک کہنے کی یہ ادائے خلیل بھی ان کے مقدر میں تھی!

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

اس وقت سے یادوں کا اک سیل رواں ہے جو رہ رہ کر ذہن میں ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔

ڈاکٹر خلیل احمدؒ — میرے دادا سے زیادہ میرے دوست تھے۔ زمین سے جڑے اور تصنیف رجال میں منہمک افراد کی طرح شاید یہ ان کی بھی کمزوری تھی کہ نالائقوں سے محبت کر بیٹھتے تھے اور انھیں کسی لائق بنانے کی دھن خود پر سوار کر لیتے تھے۔ چنانچہ مجھے بھی انھوں نے خوب سر چڑھایا؛ ان کا اپنا پن ایسا تھا کہ دادا کا ''دادا جان'' والا ادب مجھ سے کبھی ہوا ہی نہیں؛ کمیت کے اعتبار سے میں ان کے ساتھ بہت کم رہا مگر جتنا رہا کبھی کوئی بات کہنے میں حتی کہ اختلاف اور تنقید کرنے میں بھی کوئی جھجک نہیں ہوئی۔ وہ بھی عمر، رشتے، علم، تجربے... بلکہ ہر ہر اعتبار سے بڑے ہونے کے باوجود بڑے ہونے کی دھونس جمائے بغیر ''آپ، آپ'' کہہ کر ایسے گفتگو کرتے جیسے کسی برابر والے سے کی جاتی ہے۔ کبھی کبھی ایسے سوال کرتے جیسے خود کچھ نہ جانتے ہوں اور میرے جواب دینے پر ایسا رویہ اختیار کرتے جیسے اس جواب سے علم میں اضافہ ہو گیا ہو۔ سالوں پہلے کچھ اسی انداز میں ہمیں محو گفتگو دیکھ کر ایک صاحب نے تبصرہ کیا تھا کہ: سمجھ میں نہیں آتا کہ دادا کون ہے اور پوتا کون؟

ان کے سفر آخرت اختیار کر لینے کی خبر ملی تو ان کے آخری دیدار کے لیے ہم نے بھی رختِ سفر باندھ لیا۔ میں جب ان کے پاس پہنچا تو وہ اطمینان سے لیٹے ہوئے تھے اور آس پاس کرسیوں پر لوگوں کا ہجوم تھا۔ من میں تو آیا کہ کہوں، ''چلیے اٹھیے، خواہ مخواہ لوگوں کو پریشان کیا ہوا ہے۔ سنچری تو پوری کر لیتے۔'' اور یہ جواب سنوں کہ، ''بہت خوب! ایسے تو ملنے کی توفیق ہوتی نہیں اور اب جب کہ میں قیامت تک کے آرام کو لیٹا ہوں تو چلے آئے ستانے۔'' لیکن اب دادا اس دنیا میں کوئی جواب نہیں دیں گے... اس بات کا علم تو پچھلی رات سے ہی تھا مگر ادراک اور احساس اب ہوا۔ اور کیسا دردناک احساس تھا یہ! ان شاء اللہ اب جنت میں ہی ملاقات اور جی بھر کے باتیں ہوں گی۔ اس سے پہلے کہ آنسو آنکھوں کو فتح کر لیتے میں وہاں سے پیچھے ہٹ آیا۔

علم وحکمت کا راز داں:

بلریا گنج میں تحریک وتعلیم کے بیج بونے میں دادا کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ آپ نے خود طبیہ کالج، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور غالباً علاقے کے پہلے علیگ اور گریجویٹ رہے۔ اللہ کا کرم ایسا ہوا کہ طب کی صرف ڈگری ہی نہیں تھی بلکہ حکیمانہ قلب ونظر سے بھی مالا مال تھے۔ چنانچہ تشخیص وعلاج کے محاذ پر خاصے کامیاب رہے۔ لیکن اپنے مطب اور کامیاب پریکٹس کو انھوں نے تحریکی کاز کے لیے قربان کر دیا۔ ابی بتاتے ہیں کہ دادا جماعت یا جامعہ کے کاموں میں مصروف ہوتے۔ بابا (دادا کے والد) مطب پہنچتے اور دیکھتے کہ دادا مطب پر نہیں ہیں۔ ''یہ پھر مدرسے کے چکر میں غائب ہوگا،'' کہہ کر سر پیٹتے اور دادا کی تلاش میں نکل جاتے۔ جب دادا دور سے بابا کو آتے ہوئے دیکھتے تو دھیرے سے سرک جاتے اور تیزی سے سائیکل چلاتے ہوئے اپنے مطب پہنچتے تاکہ بابا کے 'عتاب' سے بچا جا سکے۔ ایسا کبھی کبھار نہیں، تقریباً روز روز ہوتا۔ یوں تحریک اور تعلیم کے سامنے مطب ہمیشہ ان کی ثانوی ترجیح رہی۔ پھر جیسے ہی چچا نے بی یو ایم ایس مکمل کیا، دادا نے اپنا کلینک ان کے حوالے کیا اور تحریکی کام کے لیے یکسو ہو گئے۔ یہ ترکِ تعلق قارئین کو اس غلط فہمی میں مبتلا کر سکتا ہے کہ دادا کو طب اور طب کو دادا سے کچھ خاص دلچسپی نہیں رہی ہوگی... لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ:

دونوں طرف 'تھی' آگ برابر لگی ہوئی

ایک جانب، دادا پر علم طب کی ضیا پاشیوں کا یہ عالم تھا کہ ان کی پریکٹس بہت کامیاب پریکٹس تھی، بالخصوص ماہر امراض اطفال کی حیثیت سے دور دور تک ان کے نسخوں کی دھوم تھی۔ ان نسخوں میں کچھ ایسے بھی تھے جنھیں دادا کے مجتہدانہ ذہن نے تجربات کی کسوٹی سے گزار کر حتمی شکل عطا کی تھی۔ مریضوں کے ساتھ حسن سلوک اور خیر خواہی نے اس شہرت میں چار چاند لگا دیے تھے۔ دوسری طرف، دادا کی علم طب سے محبت کا یہ عالم تھا کہ اپنی پریکٹس کو عملاً ترک کر دینے کے بیسیوں سال بعد بھی میں نے انھیں انگریزی کی موٹی موٹی طبی کتابوں کا مطالعہ کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ یونانی کے علاوہ انگریزی، ہومیو پیتھک اور بایو کیمک طبی کتابوں کا مطالعہ بھی ذوق وشوق سے کیا کرتے تھے۔

البیرونی کے بارے میں آتا ہے کہ مرض الموت میں ایک دانشور ان کی مزاج پرسی کے لیے

آیا۔ باوجود اس کے کہ البیرونی تکلیف میں تھے انھوں نے اس عالم سے ریاضی کا ایک مسئلہ پوچھ دیا جس پر وہ غور وفکر کر رہے تھے۔ البیرونی کی اس درخواست پر وہ عالم حیرت زدہ ہوگئے، پوچھا: کیا اس حال میں بھی جاننا ہے؟ البیرونی نے جواب دیا: اس بات کا علم حاصل کر کے دنیا سے رخصت ہونا، جاہل رہ کر چلے جانے سے بہتر ہے۔ کریئرازم کے اس زمانے میں جہاں علم سیکھنے کا واحد مقصد حصولِ مال کے بہتر سے بہتر وسیلے کی تلاش ہے، علم کا یہ پاکیزہ ذوق میں نے دادا ہی میں پایا۔ اس علم وحکمت کے جوہر اس وقت خوب خوب کھلتے جب ڈاکٹروں کی محفل میں کسی موضوع پر گفتگو ہوتی تو سب سے ''پرانے'' ہونے کے باوجود دادا کے پاس latest موضوعات، تحقیقات، ادویہ، اور procedures وغیرہ سے متعلق جانکاری ہوتی۔

ذوق مطالعہ کا باغباں:

دادا کو مطالعہ بہت مرغوب تھا۔ دینی وتحریکی کتابوں کا مطالعہ کرتے رہتے تھے۔ نئی کتابیں دستیاب نہ ہوتیں تو پرانی کتابوں کو ہی از سرنو پڑھتے تھے۔ بالخصوص قرآن وحدیث سے متعلق تصانیف کا بصد شوق مطالعہ کرتے۔ ساتھ ہی ساتھ، جیسا کہ اس سے پہلے ذکر ہوا، اتنے ہی انہماک سے میں انھیں طبی کتابوں کا مطالعہ کرتے ہوئے دیکھتا تھا۔ انگریزی قواعد کی اکتا دینے والی کتابوں کو بھی ایسے ذوق وشوق سے پڑھتے تھے جیسے ناول پڑھ رہے ہوں۔

مطالعہ کرنے کے ساتھ ساتھ مطالعہ کروانے کی ایک عجیب وغریب صلاحیت بھی ان کے اندر تھی۔ مجھے لکھنے کا شوق تھا لہٰذا دادا سے تعریف سننے کے چکر میں میں اپنی لکھی ہوئی ''کہانیاں'' ان کو دکھایا کرتا تھا۔ آج جب میں یہ تحریر لکھ رہا ہوں تو پوری ایمانداری سے لفظ ''کہانیاں'' کو واوین کے درمیان لکھ رہا ہوں۔ وہ اس لیے کہ ایک مرتبہ اپنے بچپن کی لکھی ہوئی ان تحریروں پر نظر پڑ گئی تھی تو شروع سے صاحب تحریر ہونے کا سارا نشہ ہرن ہوگیا تھا۔ میں تو بچہ تھا، اور اپنی تحریر تو ویسے بھی الا ماشاءاللہ سب کو اچھی ہی لگتی ہے، لیکن ان ہفوات کی بڑے بڑے مصنفین کو پڑھنے والے ایک خوگرِ مطالعہ کے سامنے بھلا کیا وقعت ہوسکتی تھی؟ چلیے ایک شریف انسان سے توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ کاغذ نہ پھاڑے، بچے کو نہ جھڑکے اور اس سے نہ کہے کہ ''بیٹا! تم سے نہ ہو پائے گا!'' لیکن اس بات کی امید تو ہرگز نہیں کی جاسکتی

کہ کاغذ پر بکھیرے گئے بے ربط الفاظ کی منھ بھر بھر کر تعریفیں کی جائیں اور کہا جائے کہ ''واہ! کیا لکھا ہے۔ اتنی اچھی کہانی؟ کون سکھایا ہے؟'' اور میں اترا اترا کر بتاؤں کہ خود سے لکھی ہے تو مزید بے یقینی کے عالم میں پوچھیں کہ ''سچ میں؟'' اور پھر گود میں بٹھالیں اور تعریفوں کی فلک بوس عمارتوں کی نئے سرے سے تعمیر کے درمیان ایک جملہ یہ بھی کہہ دیں، ''لیکن میں ایک طریقہ جانتا ہوں جس سے اور زیادہ اچھی بلکہ بہت ہی زیادہ اچھی کہانیاں لکھی جاسکتی ہیں۔'' متجسس بچے کو بھلا اور کیا چاہیے ہوتا، میں نے فوراً وہ جادوئی نسخہ جاننا چاہا جس سے مزید بہتر کہانیاں لکھی جاسکیں۔ دادا نے کہا کہ مختلف کہانیوں کا مطالعہ کرنے سے اور زیادہ اچھی کہانیاں لکھی جاسکتی ہیں۔ میرے ارمانوں پہ اوس پڑ گئی۔ دادا بھی آخر جواں عزائم کو سمجھے نہیں اور دے دیا گھسا پٹا مشورہ! میں نے ذرا بے رخی کے ساتھ سمجھایا کہ ''دادا! مجھے اپنی کہانیاں لکھنی ہیں، کسی دوسرے کی کہانیاں پڑھ کر وہی سب لکھنے میں کون سا کمال ہے؟'' دادا نے اب بھی پوتے کے چکنے گھڑے جیسے دماغ کا ماتم نہ کیا بلکہ پیار سے سمجھایا کہ ''یقیناً کہانیاں اپنی ہی لکھنی ہیں، لیکن کہانی لکھتے کیسے ہیں، اچھی کہانی بیان کیسے کی جاتی ہے، کہانی کے ذریعہ اچھا اچھا پیغام کیسے دیا جاتا ہے، الفاظ کو استعمال کیسے کیا جاتا ہے وغیرہ وغیرہ تو مختلف کتابوں کے مطالعے ہی سے آئے گا۔'' بات میری سمجھ میں آگئی۔

مجھے آج بھی اچھی طرح یاد ہے کہ پہلی مرتبہ دادا نے میرے لیے نو کتابیں بھیجیں۔ ان میں زیادہ تر مائل خیر آبادی کی کتابیں تھیں۔ میں نہیں بھول سکتا کہ مائل خیر آبادی کی ''ڈر کیسا؟'' وہ پہلی غیر درسی کتاب تھی جو میں نے پڑھی اور مائل خیر آبادی کو اپنا دل دے بیٹھا۔ ''انصاف کا کرتب'' اور ''تین تارے'' اس کے بعد۔ ایک آدھ کتابیں اور پڑھیں۔ دادا نے کمال عیاری سے ان نو کتابوں میں ''ہادیِ اعظم'' بھی رکھ دی تھی۔ لیکن میں پہلے پہل ان کے 'جھانسے' میں نہیں آیا، اُس وقت میں نے صرف کہانی کی کتابیں پڑھیں اور کئی کئی بار پڑھیں۔ جب سب ختم ہوگئیں تو دادا سے مزید کتابیں طلب کیں۔ اگلی بار دادا کی طرف سے تقریباً سو کتابیں موصول ہوئیں جن میں مائل خیر آبادی، افضل حسین اور دیگر مصنفین کی چھوٹی چھوٹی کتابیں شامل تھیں۔ جب جب مجھے کتابیں ملتیں میں روزانہ ایک کتاب پڑھتا، کبھی چین نہیں آتا تو دو دو پڑھ لیتا، مجھے یاد ہے پہلی کتاب ماہر القادری کی ''دریتیم'' تھی جسے میں ایک دن میں نہ پڑھ سکا تھا، اسے مکمل کرنے میں دو دن لگے تھے۔ میں چاہتا کہ کتابیں ختم نہ ہوں لیکن

وہ ہوجاتی تھیں، میں انھی کتابوں کو پھر پڑھتا اور دادا سے نئی کتابوں کا تقاضا شروع کر دیتا۔ نہ میرے تقاضے ختم ہوئے اور نہ دادا کی عنایات۔

میری زبان سے مائل خیرآبادی کی تعریفیں سن کر دادا بھی ان کی تعریف کرتے اور انھیں ''بچوں کا مودودی'' کہتے۔ اب یہ مودودی کون ہیں؟ میں پوچھتا اور دادا مجھے بتاتے۔ مطالعہ کا شوق یقیناً کہانیوں سے شروع ہوا تھا، لیکن یہ بات طے تھی کہ معاملہ یہیں نہیں تھمے گا، سیرت اور تاریخی واقعات یعنی کہانیوں سے سچی کہانیوں اور پھر تمام سچی باتوں تک ذوق پروان چڑھتا گیا۔ ''سلامتی کا راستہ''، ''بناؤ اور بگاڑ'' اور ''خطبات'' وغیرہ نے دل کی دنیا بدل دی۔ اور اب میں مولانا مودودیؒ کی کتابوں پر اس طرح ٹوٹ پڑا جیسے بھوکے دسترخوان پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔

اسی طرح میری خودی کے اقبالؔ آشنا ہونے میں بھی دادا ہی کا ہاتھ ہے۔ اسکول میں میں ''سارے جہاں سے اچھا'' اور ''لب پہ آتی ہے دعا'' والے اقبالؔ کو تو جان گیا تھا لیکن دادا نے جب ۱۹۹۷ء کی ''شب و روز'' ڈائری دی، جس میں ''شکوہ'' و ''جواب شکوہ'' چھپی تھیں، تو میں ''خودی'' اور ''شاہین'' والے اقبالؔ سے متعارف ہوا۔ یہ نظمیں مجھے اتنی پسند آئیں کہ فوراً ازبر ہوگئیں۔ میں گھر پر وقت بے وقت بلکہ ہر وقت انھیں گنگناتا رہتا۔ پورے اسکول میں شہرہ ہوگیا کہ مجھے شکوہ و جواب شکوہ یاد ہے۔ چنانچہ ان ٹیچروں نے بھی جن سے میں ذاتی طور پر واقف نہ تھا مجھے بلا بلا کر اپنی کلاسوں میں یہ نظمیں پڑھوائیں۔ دادا نے یہ بات کہہ کر دل میں اک آگ ہی لگا دی کہ ڈائری میں چھپی دونوں نظمیں مکمل نہیں بلکہ انتخاب ہیں، اور یہ کہ اصل نظمیں بہت بڑی بڑی ہیں۔ یہ سن کر میرا وہ حال ہوا جو شاید ہی کسی مجنوں و فرہاد کا ہوا ہو۔ میں نے مکمل نظموں کا تقاضا کیا اور وصالِ شکوہ و جواب شکوہ کے خوابوں میں دن گزارنے لگا۔

عشق کو فریاد لازم تھی سو وہ بھی ہو چکی
اب ذرا دل تھام کر فریاد کی تاثیر دیکھ

فریاد کی تاثیر اور خوابوں کی تعبیر بڑی شاندار رہی۔ دادا مکمل شکوہ و جواب شکوہ نہیں، پوری ''کلیات اقبال'' ہی اٹھا لائے جو ہفتوں اور مہینوں تک میرا اوڑھنا بچھونا بنی رہی۔

روکوں نہیں تو یہ داستان پھیلتی ہی چلی جائے گی، مختصراً بس اتنا ہی عرض کروں گا کہ میں دادا کا

احسان مند ہوں کہ کتابوں سے یہ دوستی ان سے دوستی کے بغیر ممکن نہ تھی!

زبان دانی کا ہوشیار وکیل:

دادا انگریزی کا نہایت ستھرا ہوا ذوق رکھتے تھے۔ انگریزی زبان وقواعد کی دسیوں کتابوں کا مطالعہ کر چکے تھے اور کرتے ہی رہتے تھے۔ Wren and Martin سے انھوں نے ہی متعارف کرایا۔ اور بھی دیگر کتب کا ذکر کرتے۔ صرف ذکر نہیں کرتے بلکہ تقابلی طور پر ان کے حسن وقبح پر گفتگو بھی فرماتے نیز طالب علم کو اس کے مزاج اور دلچسپی کے اعتبار سے کتاب تجویز کرتے تھے۔ بلریا گنج میں میرا رہنا بہت کم ہوا لیکن جب جب جانا ہوتا تو میں دادا کے کمرے ہی میں سوتا تھا۔ صبح جب آنکھ کھلتی تو میں دیکھتا کہ دادا صبح سویرے لڑکوں کو انگریزی پڑھا رہے ہیں۔ طلبہ نیم دائرہ بنائے کرسیوں پر بیٹھے رہتے اور دادا، انھی کے درمیان بیٹھ کر کبھی اس کی تو کبھی اس کی کاپی میں جھانک کر، انگریزی قواعد کے بنیادی تصورات کی توضیح کرتے اور طلبہ کو عملی مشق کراتے۔ جب تک طلبہ خود سے دسیوں جملوں کا درست ترجمہ نہ کر دیتے، دادا مطمئن نہ ہوتے۔

دادا نے مجھے بھی اپنا طالب علم بنانا چاہا، لیکن مجھے انگریزی سیکھنے میں قطعاً دلچسپی نہیں تھی۔ میں اردو میڈیم اسکول کا طالب علم تھا جہاں سارے مضامین اردو میں پڑھائے جاتے تھے۔ غیر درسی مطالعہ، جس کا مجھے شوق تھا، اس کی زبان بھی فطرتاً اردو ہی تھی۔ انگریزی کے مضمون میں جتنا پڑھایا جاتا اتنا پڑھ کر اچھے نمبر آجاتے تھے، بس میں انگریزی سے اس سے زیادہ کوئی واسطہ نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ لیکن دادا، جو عموماً میری ہر بات مانتے تھے، اس mediocre سوچ کے قائل نہ تھے۔ وہ زبانوں کی اہمیت پر بہت زور دیتے تھے۔ کہتے تھے کہ آج کے زمانے میں علم کے خزانے انگریزی زبان میں ہیں، اس سے نابلد رہ کر نہ دنیا کمائی جاسکتی ہے اور نہ دین کی کوئی قابل قدر خدمت انجام دی جاسکتی ہے۔ اس وقت ایسی گہری باتوں اور ان کی معنویت کو کلی طور پر سمجھنا میرے لیے مشکل تھا۔ میں تو یہ دیکھ رہا تھا کہ انگریزی میں اچھے نمبر لانا چنداں دشوار نہیں اور کلاس میں جب آپ کی پہلی پوزیشن ہو تو علم کی اس سے بلند معراج بھلا ہو بھی کیا سکتی ہے جس کے لیے انگریزی سیکھنے کی صعوبت برداشت کی جائے؟

ویسے ہونی کو ٹالنے میں اپنی ساری ذہانت صرف کر دینے کے باوجود مجھے اس بات کا اندازہ

تھا کہ انگریزی سے زیادہ دنوں تک بھاگنا ممکن نہیں ہوگا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ میں اس معاملے میں 'سیاست' بھی نہیں کرسکتا تھا۔ اب ذکر آ ہی گیا ہے تو چلیے اس 'سیاست' والی بات کو بھی مکمل کرلیں۔ بات یہ تھی کہ امی اور ابی مجھ سے اس بات پر خفا رہتے تھے کہ میں امتحان کے زمانے میں بھی اپنے کورس کی کتابوں کا مطالعہ کرنے کے بجائے غیر درسی کتابوں کے مطالعے میں منہمک رہتا ہوں، ایسے میں جب بھی مجھے ڈانٹ پڑنے کا ہلکا سا خطرہ بھی محسوس ہوتا، میں چپ چاپ اپنی کتاب اٹھا کر دادا کے پاس چل دیتا کہ جس کی شامت آئی ہے، آ کر دادا کی موجودگی میں مجھے ڈانٹ لے! اس طرح چاہے آئندہ روز ہی امتحان کیوں نہ ہو، میں اطمینان سے دادا کی پناہ میں اپنی من پسند کتابوں کے مطالعے میں مشغول رہتا۔ دوسری طرف جب دادا مجھے کیلا، ابلا ہوا انڈا، چنا یا چیکو جیسی صحتمند چیزیں کھلانا چاہتے تو میں امی اور ابی کی گود میں جا چھپتا اور میری رونی صورت دیکھ کر وہ دونوں نرم پڑ جاتے اور یوں عموماً میری گلوخلاصی ہوجاتی۔ لیکن انگریزی کا مسئلہ ایک ایسا مسئلہ تھا جس میں ایسی کسی سیاست کا کوئی موقع نہیں تھا کیونکہ اس معاملے میں امی، ابی اور دادا سب یک زبان تھے۔ دادا تو بالکل پیچھے ہی پڑے ہوئے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ بلریا گنج میں رات کو کھانے اور نماز کے بعد ہم بستر پر دراز ہوکر مزے مزے کی باتیں کررہے تھے کہ دادا نے پھر انگریزی کا قصہ چھیڑ دیا اور مجھے بات کو ٹالنے کے لیے یہ کہنا پڑا کہ، ''دادا، اب اس مچھر دانی میں کیا انگریزی سیکھیں گے؟ اس بار رہنے دیں نا، جب میں بڑا ہوجاؤں گا تب دیکھیں گے۔''

میرے یہ داؤ پیچ زیادہ دن نہیں چلے اور چار و ناچار مجھے دادا کا طالب علم بننا پڑا۔ میں حلف اٹھا کر کہہ سکتا ہوں کہ دادا نے اتنی مشکل کسی کو کچھ بھی سکھانے میں نہیں اٹھائی ہوگی جتنی مجھے انگریزی پڑھانے میں۔ میں وہ جو پہلی جماعت میں ٹیچر سے پوچھ چکا تھا کہ (G سے شروع ہونے والے لفظ) Gun کو 'گن' کیوں پڑھتے ہیں 'جن' کیوں نہیں پڑھتے، اب پانچویں یا چھٹی جماعت میں تھا۔ اسکول کی ٹیچر سے تو پھر بھی لحاظ ہوتا ہے، دادا تو خیر بالکل ہی اپنے تھے۔ انھوں نے بطور ٹیچر اپنی پوری زندگی میں شاید اس طرح کے سوالوں کا سامنا نہ کیا ہو کہ انگریز کوئی ایک اصول کیوں نہیں بنا لیتے، یہ put کا سیکنڈ اور تھرڈ فارم بھی put ہی کیوں ہے؟ اور اگر ہے تو eat کا بھی وہی رہے، یہاں پر ate اور eaten کہاں سے آ گئے؟ اس سے بھی اعلیٰ یہ کہ go کا went سے تو کوئی تعلق ہی سمجھ میں نہیں

آتا۔ جب من مانی ہی کرنی ہے تو پھر قانون وقواعد کو سیکھنے کی کیا ضرورت ہے؟ دادا یہ سب جھیل گئے۔ میرے سوالات سے پریشان ہونے کے بجائے خوب محظوظ ہوتے، شاید سوچتے ہوں کہ یوں نت نئے اعتراضات کرنے کے بہانے سہی مگر اصول وقواعد ذہن نشین تو ہو رہے ہیں۔ خدا خدا کر کے tense کے وہ اسباق جنھوں نے مجھے tensed کر دیا تھا ختم ہوئے۔ دادا نے ہلکے پھلکے انداز میں کچھ اور اسباق بھی پڑھائے لیکن tense والے اسباق کا قضیہ اس لیے یاد رہ گیا کہ دادا نے ان پر خوب زور دیا تھا اور ان اسباق پر جو محنت ہوئی اس کے show-off کا موقع مجھے چند ہفتوں میں ہی اس وقت مل گیا جب کلاس میں انگلش ٹیچر نے tense پڑھانے کی تمہید میں یہ پوچھا کہ tense کتنے ہوتے ہیں۔ بس پھر کیا تھا، سب کا جواب تھا تین اور میرا جواب تھا بارہ۔ ٹیچر حیران ہو گئیں کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ہمیں اس سال بارہوں ٹینس پڑھنے بھی نہیں تھے۔ خیر، ٹیچر نے مجھے کھڑا کر کے پوچھا کہ بارہ کیسے؟ پھر میں نے ماضی، حال اور مستقبل کے ساتھ indefinite، continuous، perfect، اور perfect continuous جوڑ جوڑ کر کلاس پر جو دھونس جمائی ہے اس کے کیا کہنے! ایک ایک مثال بھی دیتا گیا کہ ٹیچر یہ نہ سمجھیں کہ یونہی رٹ لیا ہے۔ ٹیچر کا دل باغ باغ ہو گیا اور باقی طلبہ کو خواہ مخواہ صلوات سننی پڑ گئی کہ دیکھو، کچھ سیکھو، محنتی بچے ایسے تیاری کرتے ہیں۔ یہ سب کچھ بہت عجیب اس لیے تھا کہ مفت کی فضیحت تمام طلبہ کے حصے میں آئی حالانکہ یہ اسباق کبھی نصاب کا جز نہیں رہے تھے، لہٰذا ان سے واقف نہ ہونے میں ان بے چاروں کا کوئی قصور نہیں تھا اور تعریفیں میرے حصے میں آئیں حالانکہ 'زمانے' پر اس گرفت کا اصل کریڈٹ میری محنت کو نہیں بلکہ دادا کے صبر وضبط کو جاتا تھا۔

دادا زبان دانی کو علم کی کنجی سمجھتے تھے۔ یہ معاملہ صرف انگریزی تک محدود نہیں تھا، وہ عربی وفارسی سیکھنے کے لیے بھی لگاتار ترغیب دلاتے تھے۔ قرآن وحدیث کو سمجھنے کے حوالے سے عربی کی اہمیت شروع سے پیش نظر رہی، لہٰذا میں نے کوئی مزاحمت بھی نہیں کی۔ دادا نے عربی کی کچھ ابتدائی کتابیں بھی دی تھیں۔ پھر عربی تو میں امی اور بڑی بہنوں سے بھی سیکھ سکتا تھا۔ لیکن فارسی کا معاملہ مختلف تھا۔ اپنے تمام تر اعتراضات کے باوجود میرے ذہن میں یہ تھا کہ انگریزی سیکھنے سے دنیا میں فائدے ہوتے ہیں، لیکن میری سمجھ میں یہ کسی طرح نہ آتا تھا کہ فارسی سیکھنے سے کیا ہوتا ہے؟ دادا بڑی تفصیل سے

فارسی کی اہمیت بتایا کرتے تھے۔ ماضی کے واقعات سناتے کہ کسی زمانے میں فارسی کا کیسا دبدبہ تھا؛ کس طرح فارسی علم و ادب کی زبان تھی اور پورے ہندوستان پر چھائی ہوئی تھی؛ مسلمان تو مسلمان ہندو و دیگر مذاہب سے تعلق رکھنے والے بھی اسے سیکھا کرتے تھے۔ اس تھا، تھی، تھے پر مجھے نہ کوئی اعتراض تھا نہ اختلاف؛ مجھے مسئلہ اس وقت ہوتا جب دورانِ کلام ایک پراسرار جست لگا کر دادا یہ نتیجہ پیش کرتے کہ فارسی علم وتہذیب کی زبان ہے، کوئی کیسا ہی علم والا ہو لیکن اس زبان سے نابلد رہ جائے تو ایک کسر بہرحال رہ جاتی ہے وغیرہ وغیرہ۔ دادا کا اصرار بڑھتا رہا، اور 'تھی' سے 'ہے' کا منطقی ربط نہ سمجھ پانے کی وجہ سے میرے تغافل کا سلسلہ بھی۔ اس معرکے میں دادا کی فتح اس وقت ہوئی جب انھوں نے شیخ سعدی اور علامہ اقبالؔ کو اپنی ٹیم میں شامل کر کے مجھے تنہا کر دیا۔ دادا کہانیوں کی جو کتابیں مجھے دیتے رہتے تھے ان میں خاصی تعداد میں سعدی کی حکایات کے تراجم بھی ہوا کرتے تھے۔ ان کتابوں میں ترجمہ ہونے کی جانب تو اشارہ نہیں ہوتا تھا لیکن گلستاں و بوستاں سے ماخوذ ہونے کا ذکر ہوتا تھا۔ دادا نے شیخ سعدی کی حکایات کے بارے میں میری معلومات میں اضافہ کیا اور بتایا کہ ان کی اصل کتابوں کا نام ''گلستاں'' اور ''بوستاں'' ہے جو سبق آموز حکایتوں کا خزینہ ہیں۔ میں نے دادا سے گلستاں و بوستاں کے لیے درخواست کی۔ تب دادا نے، پورا ماحول بنانے کے بعد، یہ بم پھوڑا کہ گلستاں اور بوستاں تو فارسی میں ہیں۔ میرے فارسی نہ سیکھنے کے ارادوں پر دادا کی یہ ضرب کاری تو تھی مگر فیصلہ کن نہیں۔ صرف دو کتابوں کے لیے فارسی سیکھ لوں؟ میں سوچ میں پڑ گیا۔ لیکن دادا نے میرے نفس امارہ کو اس وار سے عہدہ برآ ہونے کا موقع نہیں دیا۔ اپنے حملوں کو تیز کرتے ہوئے انھوں نے علامہ اقبالؔ کے بارے میں یہ ''نئی'' بات بتائی کہ ان کے کلام کا ایک بڑا حصہ اردو میں نہیں بلکہ فارسی میں ہے۔ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ میری توجہ دیکھ کر دادا یقیناً سمجھ گئے ہوں گے کہ انھوں نے بازی جیت لی ہے، چنانچہ انھوں نے ''اسرارِ خودی'' اور ''رموزِ بے خودی'' اور کلام اقبالؔ کے دیگر مجموعوں کے بارے میں بتایا۔ پھر کہا کہ صرف ایک بڑا حصہ نہیں بلکہ اقبالؔ کے کلام کا اصل اور اہم حصہ فارسی میں ہے۔ اور علامہ اقبالؔ نے فارسی زبان کو اپنے اصل پیغام کے لیے اس لیے چنا کہ اردو زبان اور شاعری ان بلند خیالات کی متحمل نہیں تھی۔ میں ان پے در پے حملوں کی تاب نہ لا سکا۔ دادا کا جادو چل چکا تھا۔ سعدی و اقبال سے استفادے کی خاطر میں فارسی سیکھنے کے لیے تیار ہو گیا۔ دادا عملی آدمی تھے، انھوں نے دیر

نہیں کی۔ وہیں ممبئی میں میرے لیے ڈھونڈ ڈھانڈ کر فارسی کا ایک استاد مقرر کر دیا۔ ابی ویسے بھی دادا کے ہر اشارے کو حکم سمجھتے تھے لیکن پھر بھی تاکید کر دی کہ میرے بلریا چلے جانے کے بعد بھی یہ سلسلہ بند نہیں ہونا چاہیے۔

علم و تعلم کا قدر داں:

دادا علم کی قدر کرتے تھے۔ علماء اور علم دوست حضرات کا خصوصیت سے احترام کرتے اور اچھے الفاظ میں ان کا تذکرہ فرماتے۔ خود میں نے دادا کو مولانا رحمت اللہ اثری، مولانا عنایت اللہ سبحانی، مولانا محمد طاہر مدنی، مولانا نعیم الدین اصلاحی وغیرہ کے ساتھ دیکھا ہے۔ انتہائی کسر نفسی کا رویہ اختیار کرتے۔ جس سے بھی ملاقات ہوتی تو کبھی ملاقات سے پہلے اور کبھی ملاقات کے بعد ان کا اور ان کی گراں قدر خدمات کا تعارف کراتے جس سے میرے دل میں بھی ان شخصیات کی قدر پیدا ہو جاتی۔ ان حضرات سے میرا تعارف بھی کراتے۔ اس تعارف میں حقیقت احوال سے زیادہ ان کی امیدوں کی جھلک اور میرے لیے تربیت کا سامان ہوتا۔ علمی و فکری خدمات انجام دینے والی شخصیات کا غائبانہ تعارف بھی کراتے، اس ضمن میں ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن اعظمیؒ کا خصوصیت سے ذکر کیا جا سکتا ہے۔

دادا کی اس علم دوستی اور قدردانی کا دائرہ اس قدر وسیع تھا کہ اس چکر میں میں کئی مرتبہ عجیب مخمصے میں پڑ جاتا تھا۔ اس بات کا ذکر میں کر چکا ہوں کہ میں بلریا میں دادا کے کمرے ہی میں رہا کرتا تھا، اور بالعموم ان کی کتابوں سے استفادہ کرتا رہتا تھا۔ ایسے میں اگر کوئی کام پڑ جاتا مثلاً کسی فقیر کی آمد پر اسے اندر سے غلہ لا کر دینا ہے، اندر گھر میں اطلاع دینی ہے کہ دھوبی آیا ہے، دادی کو بلانا ہے کہ دوا نکال دیں، کسی کام سے ابی یا کسی چچا یا پھوپھی کو بلانا ہے، کسی مہمان کی آمد پر اندر چائے اور ناشتے کے لیے کہنا ہے... تو دادا مجھے ہلنے سے حکماً روک دیتے تھے۔ کسی کام کی اپنے ذہن میں پیشین گوئی کر کے میں خود دوڑ پڑوں تو اور بات ہے ورنہ کام کے سامنے آ جانے کے بعد اٹھ کر جانے کا موقع نہیں ہوتا تھا۔ دادا زیادہ تر کام تو خود ہی نپٹا دیتے، بسا اوقات کسی کو آواز دے کر بلاتے۔ اس بات کا التزام صرف خود نہ کرتے، دوسروں سے بھی کراتے تھے۔ بھولے بھٹکے مجھے کسی کام کے لیے کہہ دیا جاتا تو فوراً اس حکم کو کالعدم کرتے ہوئے کہتے، ''تم پڑھو جی''۔ یہ سب خود مجھے عجیب لگتا، اوپر سے دادا جب میرے

ہوتے ہوئے کسی کام سے اندر جاتے تھے تو میں امی ابی سے بھی سخت سست سنتا، اور کبھی کسی ناگزیر وجہ سے دادا کی نافرمانی کرتا تو وہ بعد میں پیار بھری خفگی کا اظہار کرتے اور کہتے کہ تمہارا وقت قیمتی ہے۔ ایسے موقعوں پر بڑی شرمندگی ہوتی۔ صرف اس بات پر نہیں کہ مجھ چھوٹے کے ہوتے ہوئے بڑے کام کر رہے ہوتے بلکہ اس بات پر بھی کہ: دادا میرے وقت کو جتنا قیمتی سمجھتے ہیں، کیا خود مجھے اس کی صحیح قدر و قیمت کا احساس اور پاس ولحاظ ہے؟

ان کام کے موقعوں پر دادا میرا یہ بہانہ بھی نہیں چلنے دیتے کہ دادا بہت دیر سے پڑھ رہا ہوں، اسی بہانے ستا لوں گا۔ میرے یوں کہنے پر بس مسکرا کر، اشاروں ہی اشاروں میں، بتا دیتے کہ وہ میرے جھانسے میں نہیں آنے والے... لیکن عام حالات میں بارہا اندر سے کچھ کھانے کے لیے یا چائے وغیرہ لے کر حاضر ہو جاتے کہ بہت دیر سے پڑھائی ہو رہی ہے، اب کچھ کھانے پینے کا وقت ہے۔ میں احتجاج کرتا کہ دادا مجھ سے کہہ دیے ہوتے، میں لے کے آجاتا، تو کہتے کہ ''پڑھ رہے تھے نا، اس لیے نہیں کہا۔'' میرے احتجاجات پر کبھی انتہائی خوش مزاجی سے پوچھتے، ''ابھی بھی اتنا ہی بڑا ہوں جتنا چائے لانے سے پہلے تھا؟ یا چائے لا کر کچھ چھوٹا ہو گیا ہوں؟'' مجھے نہیں لگتا کہ دادا کا یہ رویہ صرف میرے ساتھ خاص تھا، میرا تجربہ رہا کہ ہر وہ انسان جو اپنے ہاتھ میں ایک عدد کتاب اٹھالے، دادا کی نگاہ میں اس کی قدر دوچند ہو جاتی تھی۔ یوں لوگوں میں علم کی اہمیت کو راسخ کرنے کے حوالے سے دادا کی قولی وعملی شہادت کا انداز بڑا انوکھا اور دل نشیں تھا۔

انکسار مجسم:

مجھے علم تاریخ اور بڑے لوگوں کی سوانح سے دلچسپی رہی ہے۔ چونکہ دادا کی شخصیت میں عظیم تاریخی شخصیات کا ایک پرتو نظر آتا تھا، اس لیے شروع ہی سے من کرتا تھا کہ ان کے بارے میں سب کچھ جان لوں۔ بہت ساری باتیں ابی، امی، چچا، پھوپھیوں اور دیگر لوگوں سے سنتا بھی آیا تھا لیکن بھری دوپہر میں قمقموں سے روشنی کیوں حاصل کی جائے؟ براہ راست خورشید ہی سے استفادہ کیوں نہ کر لیا جائے؟ اسی خیال سے میں دادا سے ان کے بارے میں پوچھتا، بے جھجک اور بے تکلف پوچھتا، لیکن جب جب دادا کے سامنے اس قسم کی کوئی بات چھڑتی، وہ بڑی مہارت سے بات کا رخ موڑ دیتے... اور

بہت دیر بعد مجھے اندازہ ہوتا کہ دنیا جہان کی نہ جانے کتنی باتیں ہم کر چکے ہیں لیکن وہ اصل سوال جو میں نے پوچھا تھا اس کا جواب نہیں مل سکا۔ یہ اتفاق نہیں تھا، بلکہ دادا کی خصلت تھی۔ وہ اپنے بارے میں بہت کم بلکہ کچھ بھی نہیں بتاتے تھے۔ لوگ عموماً اپنے منھ میاں مٹھو بننے میں خوشی محسوس کرتے ہیں؛ چائے پلا پلا کر اپنے کارناموں کی تبلیغ و اشاعت کرتے ہیں؛ فون کر کر کے اپنی پوسٹس لائک کرواتے ہیں؛ بہت سے تو پوری نیک نیتی کے ساتھ ''کہنا تو نہیں چاہیے'' وغیرہ کے سابقے لگا لگا کر اپنے گن گاتے ہیں؛ اور ایسے بھی ہیں جو دوسروں کی خدمات کا کریڈٹ خود ہتھیا لینے میں بھی نہیں ہچکچاتے؛ لیکن دادا کا معاملہ بالکل برعکس تھا۔ ہم سکون اور اطمینان سے گھنٹوں باتیں کرتے رہتے لیکن جہاں موقع دیکھ کر میں کوئی ایسا سوال پوچھ لوں تو دادا ایک دم الرٹ اور محتاط ہو جاتے۔ ایسے میں کبھی خاموشی تو کبھی کسی لطیفے کی پناہ لیتے۔ کبھی کمال عیاری سے بات میں بات پیدا کر کے گفتگو کا رخ بدل دیتے۔ کبھی سوال سے متعلق کوئی حکیمانہ نکتہ یا کوئی تربیتی پہلو نکال لاتے۔ الغرض خود کو چھپا کر رکھنے اور میری توجہ کے انعطاف کے لیے سو بہانے ڈھونڈ لیتے لیکن وہ ایک بات منھ سے نہ نکلتی جس میں اپنی ذات کے نمایاں ہونے کا کوئی ادنی سا شائبہ بھی موجود ہو۔

خدا گواہ ہے کہ میں نے پوچھنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ جب مجھ پر یہ عقدہ پوری طرح نہیں کھلا تھا کہ دادا اس طرح کے سوالات سے قصداً دامن بچا لیتے ہیں، اس وقت مجھے لگتا کہ شاید میرے پوچھنے ہی میں کوئی کسر رہ گئی ہے۔ بسا اوقات میں خاموش ہو جاتا لیکن اکثر مزید صراحت سے اپنا سوال دہراتا۔ ایسے ہی کسی موقع پر جب میں نے دادا سے ان کی تحریکی زندگی کے بارے میں کچھ جاننا چاہا اور جواب نہ جانے ایران و توران کی کس داستان کی طرف نکل گیا تو میں نے صراحت سے ٹھہر ٹھہر کر پوچھا: ''دادا! یہ بتائیے کہ آپ نے جماعت کا کام کیسے کیا؟ کام کیسے شروع کیا؟ کیا کیا کیا؟ کن کن جگہوں پر کیا؟ لوگوں سے رابطہ کیسے کیا؟ کتنے لوگوں کو جماعت سے قریب لے آئے؟ کتنے لوگوں تک دعوت پہنچائی؟ کتنوں کو رکن بنایا؟ ان میں سے کچھ کا نام بتا سکتے ہیں آپ؟'' ان صریح (گو بے ڈھنگے) سوالات میں بھی انھوں نے اپنے بچنے اور میری تربیت کا پہلو ڈھونڈ لیا، ارشاد فرمایا، ''اب یہ کسے یاد کہ کب کتنا اور کیا کیا کام ہوا؟ بھئی مجھ سے تو کوئی کام ڈھنگ سے نہیں ہوتا۔ مجھے تو یہ بھی نہیں پتہ کہ میری وجہ سے کوئی تحریک کے قریب آیا بھی کہ نہیں، رکن وُکن تو بہت دور کی بات ہے،'' پھر ذہن پر زور

ڈال کر ایسا تاثر دیا جیسے سوال کا جواب سچ میں دے ہی دیں گے، اور کہا، ''ہاں! ایک ہے۔ ایک رکن کا نام بتا سکتا ہوں۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ وہ ابھی رکن بنا نہیں ہے، بننے والا ہے۔ خدا کرے کہ جلدی سے بن جائے۔'' یہ جواب سن کر پہلے پہل تو میں خوشی سے پھولا نہیں سمایا کہ چلو کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے، معاملہ صفر سے ایک پر تو پہنچا، لیکن فوراً ہی احساس ہوا اور دادا کے چہرے پر پھیلی ہوئی مسکراہٹ نے اس احساس کو مؤکد کر دیا کہ دادا کا یہ ''ایک'' تو میں ہی ہوں۔ دھیان دینے کی بات یہ ہے کہ یہ گفتگو اس وقت کی ہے جب میں ایس آئی او کا ممبر بھی نہیں بنا تھا، جماعت کی رکنیت کا تو تخیل بھی محال تھا، لیکن دادا کے ذہن میں بات دو اور دو چار کی طرح صاف تھی۔ اور وہ ایسے ہی دور دور کی کوڑیاں لا کر میرے ذہن میں بھی کچھ غیر مبہم نہ چھوڑنا چاہتے تھے۔ ایک زمانے تک دادا مجھے ''علامہ'' کہہ کر پکارتے رہے، خیال رہے کہ یہ وہ زمانہ تھا جب مجھے علامہ کا مطلب تو دور کی بات ہے یہ بھی نہیں پتہ تھا کہ یہ اقبالؔ کا نام نہیں ہے۔ مجھے لگتا رہا کہ شاید شاعر مشرق کے مداح کی حیثیت سے ان کے نام کا یہ حصہ بطور لقب میرے حصے میں آ رہا ہے۔ یہ دادا کی تربیت کا منفرد انداز تھا۔ شاید ان کو لگتا تھا کہ سامنے والے میں کسی چیز کا شائبہ ہو یا نہ ہو لیکن اگر میں اس کی تعریف کروں اور ترغیب دلاؤں تو دیر یا سویر اس میں وہ چیز پیدا ہو کر رہے گی۔ اب کسی کے علامہ کہنے سے کوئی علامہ بن تو نہیں جائے گا لیکن آخرت میں ان شاء اللہ دادا کو ان کی پاکیزہ نیتوں اور اونچے خوابوں اور پیہم کوششوں کا اجر ضرور مل کر رہے گا۔

خیر، بات یہ ہو رہی تھی کہ بلا مبالغہ میں نے سیکڑوں مرتبہ کوشش کی کہ دادا سے کسی نہ کسی بہانے ان کے بارے میں کچھ جان سکوں لیکن ہر مرتبہ ناکام رہا۔ جب یہ اندازہ ہو گیا کہ وہ اس طرح کے سوالوں کا سیدھی طرح جواب نہیں دیں گے تو بھی میں نے ہار نہیں مانی۔ میں سوالات کی گیند کو طرح طرح سے اسپن اور سوِنگ کرا کے پھینکتا لیکن وہی ڈھاک کے تین پات۔ دادا نے اپنے اندر نہ جانے کون سی مشین لگائی ہوئی تھی کہ بھولے بھٹکے بھی کوئی بات اپنے بارے میں نہیں نکلنے دیتے تھے۔ وہ ہمیشہ میرے اس مقصد سے پوچھے گئے ٹیڑھے سوالوں میں سے اتنے حصے کا جواب دیتے جہاں تک ان کے تعلق سے کوئی بات نہ آنے پائے اور جہاں سے اصل بات شروع ہونی ہوتی وہیں پر بات بند کر دیتے یا گھما دیتے۔

خود دادا سے ان کے بارے میں جاننے کی آخری کوشش میں نے پچھلے سال کی تھی۔ درازی

عمر کے باوجود اس معاملے میں دادا کا کنٹرول اب بھی مثالی تھا۔ میں نے بہت دور دراز کی تمہید باندھی تو دادا نے اپنے دادا کے بارے میں بتایا کہ وہ ہیڈ ماسٹر تھے۔ اپنے بچپن کے بارے میں ایک بات یہ بتائی کہ ان کے اسکول سے ایک مرتبہ انگریزوں کے خلاف ریلی نکالی گئی تھی، غالباً اساتذہ یا علاقے کے بڑوں کے کہنے پر دادا نے اس ریلی میں طلبہ کی قیادت کی تھی۔ ریلی پر اچانک پولس نے حملہ کر دیا اور سب لوگ منتشر ہو گئے۔ اس منتشر ہو گئے کو دادا خوب مزے سے ''کیہو ایہر بھاگا، کیہو اوہر بھاگا'' کہہ کر بار بار دہراتے اور مسکراتے رہے۔ موقع کو غنیمت جان کر میں نے سوالات کے سلسلے کو ذرا ہی سا آگے بڑھایا کہ دادا کو احساس ہو گیا کہ یہ سب تو غلط ہو رہا ہے۔ عمر بھر جس نے خود کو بنیاد کے پتھر کی طرح زمین میں چھپا کر رکھنے کی عادت ڈالی تھی، اس کے بڑھاپے کی اعصابی کمزوری سے 'ناجائز' فائدہ بھی میں صرف اسی قدر اٹھا سکا اور پھر دادا الرٹ ہو گئے، کہنے لگے، ''میں ہی کیوں سب کچھ بتاؤں، بھئی آپ بھی کچھ بتائیے اپنے بارے میں۔'' میں کہتا رہا کہ میرے بارے میں تو آپ سب جانتے ہی ہیں، میں کیا بتاؤں، لیکن دادا دوبارہ گفتگو کو اپنی طرف لے جانے کے لیے کسی طرح تیار نہ ہوئے اور یہ میری آخری کوشش بھی دھری کی دھری رہ گئی۔

میں ذکر کر چکا ہوں کہ دادا کس طرح اپنے ہاتھوں سے کام کرنے یا چھوٹوں تک کی خدمت کر ڈالنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے تھے۔ دراصل ان کے نزدیک کوئی کام چھوٹا نہیں تھا۔ جس وقت جو کام ضروری ہوتا، اس میں بلا تردد و توقف لگ جاتے تھے۔ مولانا عنایت اللہ سبحانی صاحب نے، جامعۃ الفلاح میں دادا کی تعزیتی نشست کے دوران، اس اخلاص پر بڑے جذباتی انداز میں روشنی ڈالی اور بتایا کہ ساٹھ کی دہائی میں جب دادا ناظم تھے تو جامعہ میں تعمیرات کے کام کی صبح شام نگرانی کرتے اور جب ضرورت ہوتی تو بے جھجک اینٹیں ڈھونے یا کسی دوسرے کام میں مزدوروں کا ہاتھ بٹانے لگتے۔ ان باتوں ''کو دیکھنے اور بیان کرنے والا کوئی نہیں ہوتا ہے...'' لیکن نیک نیتی، نیک نفسی، خدا ترسی اور اخلاص وللّٰہیت کی گواہ یہی چھوٹی چھوٹی باتیں ہوتی ہیں جو کسی فرد کو حقیقی معنوں میں بڑا بناتی ہیں۔

دادا کی انکساری کا ایک اہم پہلو یہ بھی تھا کہ وہ اپنے ہم عصروں سے بہت محبت کرتے تھے اور ان کی بہت قدر کرتے تھے۔ اپنے ساتھیوں کی قدر افزائی، ان سے سنجیدہ مشورے اور ان مشوروں پر

عمل ہمیشہ ان کی سرشت رہی۔ مولانا عنایت اللہ سبحانی صاحب بیان کرتے ہیں کہ دادا اپنی نظامت کے زمانے میں مولانا جلیل احسن ندویؒ سے مشورے کے لیے جاتے تو کبھی وہ صاف صاف کہہ دیتے کہ اس وقت میں مصروف ہوں یا یہ وقت میرے آرام کرنے کا ہے؛ اور دادا نظامت کے اختیارات کا استعمال کرنے، حکم دینے یا دل میں کسی کدورت کو محسوس کرنے کے بجائے چپ چاپ لوٹ آتے اور پھر دیے گئے وقت پر مستعدی سے حاضر ہو جاتے۔ یہ انکسار ان کی شخصیت کا جزو اعظم تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ اس کا مظاہرہ صرف بڑی شخصیتوں کے سامنے ہو۔ دادا بہترین مشوروں کے طالب اور قدر دان تھے، اپنے بڑوں اور ہم عصروں ہی سے نہیں، چھوٹوں سے بھی بلا تکلف مشورے لیا کرتے تھے۔ ملک حبیب فلاحی صاحب لکھتے ہیں، ''جامعہ میں میری تعلیم کے دوران وہ اکثر مجھے اپنے مطب میں لے جاتے اور میری کم سنی اور کم مائیگی کے باوجود مجھ سے جامعہ کی ترقی کے منصوبوں پر میری رائے مانگتے اور میری باتیں سن کر بہت خوش ہوتے۔''

جب میں تعلیم کے سلسلے میں دہلی منتقل ہو گیا تو دادا کبھی مجلس نمائندگان میں شرکت کے لیے تو کبھی جامعۃ الفلاح کے کسی کام سے تشریف لاتے۔ مجھے یاد ہے کہ میرے دہلی رہتے ہوئے جب دادا پہلی مرتبہ مجلس نمائندگان میں شرکت کے لیے آئے تو ہم لوگ بطور رضا کار، اپنے نگراں جناب سلیم اللہ خان صاحب (موجودہ امیر حلقہ، دہلی) کی قیادت میں، ارکان نمائندگان کو کھانا کھلانے پر مامور تھے۔ ارکان نمائندگان نے چھوٹے چھوٹے رضا کاروں پر خوب محبتیں لٹائی تھیں۔ وہاں بھی دادا نے متعدد بزرگوں سے ملاقاتیں کرائیں۔ دادا اپنے بارے میں کچھ بتانے سے تو ایسے بچتے تھے جیسے الفاظ پر ٹیکس ادا کرنا ہو، لیکن لوگ جس طرح دادا کے ساتھ ادب و احترام سے ملتے تھے اس سے مجھے پتہ چلتا تھا کہ سب کے دلوں میں دادا کا کیسا پاس و لحاظ ہے۔ بالخصوص اشفاق صاحب مرحوم جس طرح دادا کا ادب کرتے اور دادا کے حوالے سے مجھ سے محبت کرتے تھے، میں اسے کبھی بھول نہیں سکتا۔

ایک مرتبہ جب دادا دہلی آئے ہوئے تھے تو ہم دونوں مسجد اشاعت اسلام کے باہر 'صراط مستقیم' پر ٹہل رہے تھے۔ اچانک مولانا سید جلال الدین عمری صاحب آتے دکھائی دیے۔ اپنی طبیعت سے مجبور میں نے کنی کاٹنی چاہی لیکن مولانا کی نظر جب دادا پر پڑی تو انھوں نے رفتار بڑھا دی، دادا بھی میرا ہاتھ پکڑے ہوئے بڑھے۔ مولانا عمری نے اپنی عادت کے برخلاف خوب زور سے سلام کیا،

دونوں بزرگوں نے بہت گرمجوشی کے ساتھ مصافحہ اور معانقہ کیا، مولانا عمری کو اتنا دل کھول کر ہنستے اور بے تکلف ہوتے ہوئے اس سے پہلے میں نے نہیں دیکھا تھا۔ دادا نے مولانا عمری سے میرا تعارف کرایا تو وہ خفا ہوگئے کہ ان کو تو میں جانتا ہوں لیکن انھوں نے کبھی بتایا نہیں کہ یہ آپ کے پوتے ہیں۔ دادا نے میرا ہی دفاع کیا کہ یہ کوئی بتانے والی بات تو تھی نہیں، بس اطمینان ہے کہ آپ ان کو جانتے ہیں، اپنی تربیت میں رکھیے گا۔

ایک مرتبہ دادا جامعۃ الفلاح کے کسی کام سے دہلی آئے ہوئے تھے اور مجھے خبر تک نہ تھی۔ دادا اچانک دو چار افراد کے ساتھ ایس آئی او مرکز کی طرف آ نکلے۔ وہاں دیگر احباب کے ساتھ میں والی بال کھیل رہا تھا، پسینے میں شرابور۔ دادا کو دیکھ کر ان کے پاس گیا۔ پھر اپنے گندے سے کمرے میں سب کو لے کر گیا۔ لوگوں کی ضیافت اور مہمان نوازی کرنے کا شعور تو ڈھنگ سے مجھ میں اب بھی نہیں ہے، اس وقت تو خیر بالکل نہ تھا۔ لیکن کسی نے برا نہ مانا اور نہ ہی دادا نے اس کا موقع دیا۔ ملتے ہی سوالات کی بوچھار کر دی۔ آج کل مطالعے میں کون سی کتاب ہے؟ کون سا مضمون لکھا جا رہا ہے؟ حال میں کون سے مضامین شائع ہوئے ہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔ سوال کر کر کے مجھے یہ بتانے پر مجبور کر دیا کہ میرے مضامین رفیق منزل، کمپینین اور ریڈینس وغیرہ میں شائع ہو رہے ہیں۔ اس غیر رسمی ملاقات کا اختتام بڑا ہی انوکھا مگر دلآویز تھا۔ دادا نے مولانا رحمت اللہ اثری صاحب سے درخواست کی کہ مجھے نصیحت کریں اور میرے لیے دعا کریں۔ مولانا نے مجھے مضامین وغیرہ کے سلسلے میں مبارکباد دی، تعلیم اور محنت اور تحریک سے متعلق چند مختصر نصیحتیں کیں اور ہاتھ اٹھا کر دعائیں کیں جس پر سب نے آمین کہی۔

بے لوث محبتوں کا ساقی:

دادا کی محبت بڑی بے غرض تھی۔ وہ جب پہلی مرتبہ ممبرا آئے تھے تبھی سے ہماری دوستی ہوگئی تھی۔ انھی کے ساتھ رہنا، انھی کے ساتھ کھانا، انھی کے ساتھ سونا، الغرض اگر وہ گھر پر ہیں اور میں بھی اسکول میں نہیں ہوں تو یہ طے تھا کہ ہم دونوں ساتھ ہوں گے۔ لہٰذا جس دن دادا بلریا واپس چلے گئے، اس دن کسی چیز میں میرا دل نہیں لگ رہا تھا۔ میں نے امی سے اپنا یہ احساس شیئر کیا۔ اس زمانے میں موبائل فون کی آسائشیں میسر نہ تھیں۔ فون پر بھی لوکل بات چیت ہوتی تھی۔ ممبئی سے یوپی فون کرنا ہو تو

پی سی او جانا ہوتا تھا۔ امی نے مشورہ دیا کہ میں دادا کو خط لکھوں۔ مجھے خط لکھنے کا من تھا لیکن خط لکھنا نہیں آتا تھا۔ امی نے کوشش کرنے کے لیے کہا کہ جو کچھ محسوس کر رہا ہوں یا جو کچھ کہنا چاہ رہا ہوں وہ لکھ دوں، اور کچھ مشکل ہو تو پوچھ لوں۔ چنانچہ میں نے اپنی زندگی کا پہلا خط دادا کے نام لکھا۔ یقیناً وہ دو چار سطری خط ہوگا، جس میں کئی طرح کی بھونڈی غلطیاں ہوں گی، البتہ ایک بات میں نے امی سے پوچھی تھی: امی! یہ دادا کے جانے کے بعد بالکل عجیب سا خالی خالی لگ رہا ہے، اس کو کیا کہتے ہیں؟ امی نے کہا لکھ دو کہ آپ کے جانے سے گھر سونا سونا لگ رہا ہے۔ یہ ایک جملہ مجھے صاف صاف اس لیے یاد ہے کہ میں تو معصومیت سے خط لکھ کر فارغ ہو گیا؛ لیکن جب خط دادا تک پہنچا ہے تو جیسے ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ چچا سے پتہ چلا کہ دادا ہر آنے جانے والے کو میرا خط پڑھ پڑھ کر سنا رہے ہیں اور اس میں وہ گھر سونا سونا والی لائن بار بار پڑھ کر محظوظ ہوتے ہیں۔ میں نے دادا کو اسی زمانے میں کل چار پانچ خطوط لکھے ہوں گے۔ ہر خط پر یہی عالم رہا، ایک خط میں میں نے چاول کے دانے کی فرمائش بھی کر دی تھی۔ چچا نے بتایا کہ ہم لوگ کہتے رہ گئے کہ ہم بھنوالاتے ہیں لیکن دادا یہ کہہ کر کہ میرے پوتے نے مجھ سے کہا ہے، خود ہی دانہ بھنوانے گئے۔ بعد میں جب مختلف رسائل و جرائد میں مضامین کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا تب بھی دادا کی محبتیں مجھے گراں بار کرتی رہیں۔ کئی کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ بلریا میں کسی سے پہلی ملاقات ہوئی اور ان صاحب نے چھوٹتے ہی 'سہ روزہ دعوت' یا 'زندگی نو' کا حوالہ دے کر بتایا کہ میں نے آپ کا فلاں مضمون پڑھا ہے۔ پوچھنے پر ہر مرتبہ پتہ چلتا کہ اس مضمون کے شائع ہونے میں بھلے میرے قلم کا عمل دخل ہو لیکن اس کی ترویج و اشاعت میں دادا کا ہاتھ ہے۔

جب ہم لوگ بلریا پہنچتے تو ویسے بھی دادی خوب خیال رکھتی تھیں لیکن دادا کو کسی چیز پر اطمینان نہیں ہوتا تھا۔ جب دیکھو تب دادی کو حکم دیتے تھے کہ میرے پوتے کو یہ کھلاؤ وہ کھلاؤ، آج کھانے میں فلاں چیز بننی چاہیے، ایسا ہونا چاہیے، ویسا ہونا چاہیے۔ دادی بھی آخر انسان ہی تھیں، کبھی کبھی چڑ کر کہتیں کہ ہاں آپ ہی کا تو پوتا ہے (جیسے میرا تو کچھ ہے ہی نہیں!)، کبھی بتاتی تھیں کہ فلاں چیز نہیں ہے... تو دادا، کسی کا انتظار کیے بغیر، خود دکان سے جا کر لے آتے۔ بلریا جانے پر امی ابی بہت سے اعزہ و اقارب کے یہاں لے کر جاتے اور میرا کہیں جانے کا من نہیں کرتا تھا، بس دل کرتا تھا کہ میں رہوں، دادا رہیں، اور دادا کی کتابوں کی الماری رہے؛ اور ساری دنیا ہمیں اکیلا چھوڑ دے۔

دادا کو تعلیم و تعلم، مطالعہ و کتاب کی باتیں کرنا پسند تھا لیکن ایسا بھی نہیں تھا کہ ہر وقت بس یہی باتیں ہوں۔ دادا ہم لوگوں کے ساتھ کھیلتے بھی تھے۔ کبھی مٹھی بند کر لیتے اور کہتے کہ، کھولو۔ میں باوجود کوشش کے نہیں کھول پاتا تو کہتے ابلا ہوا انڈا کھاؤ، گھی کھاؤ اور دودھ پیو تب نہ طاقت آئے گی۔ چھوٹے بھائی بہنوں کے ساتھ بھی یہ کھیل کھیلتے میں نے انھیں دیکھا ہے۔ میری خوشی کے لیے دادا لوڈو اور سانپ سیڑھی جیسے فالتو کھیل بھی کھیل لیا کرتے تھے۔ اب اگر کوئی مجھ سے یہ کھیل کھیلنے کو کہے تو جتنی کوفت ہوتی ہے اس سے میں اندازہ لگا سکتا ہوں کہ دادا کے اعلیٰ ذوق پر بھی یہ کس قدر گراں گزرتا ہوگا۔ ان کھیلوں میں مجھے یاد نہیں کہ دادا کبھی جیتے ہوں۔ یقیناً ہر بار قسمت مجھ پر مہربان نہیں رہی ہوگی، دادا جان بوجھ کر الٹی سیدھی چال چلتے تھے۔ میں ویسے تو ایمانداری سے کھیلتا تھا لیکن مجھے جیتنے کے لیے قسمت پر انحصار پسند نہ تھا۔ چنانچہ ذاتی پریکٹس سے میں نے ڈائس کو پھینکنے کے کچھ ایسے طریقے 'ایجاد' کیے تھے جس سے اسی پچاسی فیصد accuracy کے ساتھ میں جو چاہتا وہ نمبر لا سکتا تھا۔ ایسے میں زیادہ تر جیت میری ہونی ہی تھی، اس پر کبھی کبھی دادا 'احتجاج' بھی کرتے تھے۔ ایک بار مجھے یاد ہے کہ ایک ہی چانس میں سانپوں سے بچتے بچاتے، چھلاتے لاتے اور سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے میں بالکل اسی نوے پر پہنچ گیا اور دادا 'ارے بھائی یہ کیا ہو رہا ہے؟ یہ کیا ہو رہا ہے؟' کہتے رہ گئے۔ اس دن ہارنے کے بعد امی سے ہنس ہنس کر بتانے لگے کہ میں 'گلمنیا' (چیٹنگ) کر کے جیتا ہوں۔ یہ الزام تو دادا نے مجھ پر لگا دیا لیکن اصل میں وہ خود اس الزام سے مبرا نہیں تھے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ دادا خود جج بن کر ہم بھائی بہنوں میں بیت بازی کا مقابلہ کراتے تھے۔ ایسے موقعوں پر دادا پوری 'دغابازی' کے موڈ میں ہوتے اور دونوں بڑی بہنوں کو چیٹنگ کرنے کے خوب خوب موقعے دیتے۔ ایک تو وہ بڑی اور دو دو ہو کر بھی ایک ٹیم ہوتیں؛ اوپر سے دادا انھیں وقت پر وقت اور ہنٹ پر ہنٹ دیے چلے جاتے؛ حد تو یہ ہے کہ کبھی کبھار ان میں سے ایک جا کر کتاب وغیرہ کھنگال آتیں اور شعر سنا دیتیں۔ میں بے چارا، چھوٹا اور اکیلا بس 'احتجاج' کرتا رہ جاتا لیکن دادا کی بارگاہ میں کوئی سنوائی نہ ہوتی۔ لہٰذا میں نے بھی 'چیٹنگ' کرنے کا ایک طریقہ ڈھونڈا تھا اور وہ تھا فی البدیہہ شعر گڑھنے کا۔ چنانچہ کسی مشہور شعر کی مرمت سے لے کر بالکل ہی واہیات شعر کی تخلیق تک سارے کام انجام دیتا، مگر ہار نہیں مانتا۔ بیت بازی کی یہ محفلیں بہت بہت مزیدار ہوتیں، لیکن کبھی ہار جیت پر منتج نہ ہوتیں۔ دادا کو شاید اسی میں

مزہ آتا تھا۔

بامقصد بے رحمی، مربیانہ ظلم وستم:

کسی نے سچ کہا ہے کہ حقائق افسانوں سے بھی زیادہ پیچیدہ ہوتے ہیں۔اب یہی دیکھیے کہ دادا کی بے لوث محبت کی داستانیں میں نے آپ کو سنائیں اور اب میں ہی ہوں جو یہ بتانے جا رہا ہوں کہ کچھ معاملات میں دادا بڑے 'بے رحم اور سنگدل' بلکہ 'ظالم اور ستمگر' واقع ہوئے تھے۔اب آپ سوچیں گے کہ میں نئے سرے سے ابلے ہوئے انڈے کھلائے جانے یا جبریہ انگریزی سکھائے جانے کا قصہ جانکاہ دہرانے جا رہا ہوں لیکن یقین مانیے کہ ایسا نہیں ہے۔یہ سب تو بہت معمولی شاخسانے تھے، دادا کے 'ظلم وستم' ان مبتذل زبردستیوں سے کہیں آگے کی چیز تھے۔

ایک عرصے تک دادا نے اس بات کا معمول بنا رکھا تھا کہ مختلف مساجد میں نماز کے بعد حدیث سنایا کرتے تھے۔مجھے کبھی سننے کا اتفاق نہیں ہوا لیکن دادا کو حدیث کی کتابوں کے ساتھ لوٹتے دیکھ کر میں پوچھتا کہ یہ کیوں لے گئے تھے تو کہتے کہ سنانی تھی۔میں کہتا کہ مجھے سنایئے تو کہتے کہ لو پوری کتاب لو، اور پڑھ لو۔میں کہتا کہ اچھا نہیں سناتے تو میں کل آپ کے ساتھ جاؤں گا اور سنوں گا کہ آپ کیسے سناتے ہیں۔تب دادا ہنس کر کہتے کہ اگر میرے ساتھ گئے تو میں کتاب تھما دوں گا اور آپ ہی کو حدیث سنانی ہوگی۔میں ڈر کر چپ ہو جاتا کیونکہ اس معاملے میں دادا پر بالکل بھی بھروسہ نہیں کیا جا سکتا تھا، وہ سچ میں وہی کر گزرتے جس کی 'دھمکی' دے رہے تھے۔میرے اندیشے بے بنیاد نہیں تھے، یہ ابھی تھوڑی سی دیر میں آپ بھی تسلیم کر لیں گے۔

مجھے جس طرح سے دادا کے بارے میں جاننے کا شوق تھا اسی طرح ان سے کوئی تذکیر یا تقریر سننے کا شوق بھی تھا۔پہلے کی طرح دوسرا ارمان بھی، باوجود میری خوب تگڑم بازی کے، کبھی پورا نہ ہوا۔ایک مرتبہ کی بات ہے، میری عمر یہی کوئی دس گیارہ برس رہی ہوگی، معمول کے مطابق رات میں بجلی کٹی ہوئی تھی؛ دادا اور میں، انھی کے کمرے کے باہر چبوترے پر کرسیاں ڈالے بیٹھے ہوئے تھے۔نہ جانے مجھے کیا سوجھی کہ میں نے دادا سے مخاطب ہو کر کہا، چلیں ایک کھیل کھیلتے ہیں۔دادا نے پوچھا، کیسا کھیل؟ میں نے کہا، آپ مجھے تین عنوان دیں، میں ان میں سے کسی ایک پر فوراً تقریر کروں گا۔پھر

میں تین عنوان دوں گا اور آپ کو کسی ایک پر فوراً تقریر کرنی ہوگی۔ دادا تیار ہو گئے۔ مجھے کسی قسم کا خوف نہ ہونے کی وجہ یہ نہیں تھی کہ میں اسکول میں متعدد تقریریں کر چکا تھا بلکہ یہ تھی کہ دادا اکیلے تھے اور اپنے تھے۔ جو من میں آئے گا بولوں گا، یا نہیں آئے گا تو کہہ دوں گا کہ نہیں آتا۔ کم از کم اسی بہانے دادا سے کچھ تو سنوں گا اور سیکھوں گا۔ دادا نے تین عنوان دیے، میں نے ایک پر دو چار منٹ کی سمع خراشی میں کوئی مشکل محسوس نہیں کی، بلکہ ایک آدھ شعر بھی جڑ دیے۔ دادا بہت خوش ہوئے اور جم کر تعریفیں کیں۔ لیکن ان سب کے بعد جب میں نے سودے کا دوسرا حصہ یاد دلایا تو دادا نے فوراً 'شکست' تسلیم کر کے میری پوری پلاننگ کا تیا پانچہ کر دیا۔ میرے زوردار احتجاج اور ''یہ تو چیٹنگ ہے'' کی صدائیں کسی کام نہ آئیں۔ خیر، دادا کو بہت خوش دیکھ کر مجھے بھی خوشی ہوئی، البتہ اپنی ترکیب کی ناکامی کا افسوس ضرور رہا۔

یہ 'ظلم' اپنے آپ میں کچھ کم نہیں تھا لیکن مجھ معصوم کو نہیں پتہ تھا کہ میرے ساتھ یک نہ شد دو شد بلکہ صد یا ہزار شد ہونے والا ہے۔ اگلے روز دادا نے وہیں چبوترے پر دو چار بچوں کو اکھٹا کیا اور رات میں لائٹ جانے پر یہی کھیل کھیلا جس میں حسب دستور بیٹنگ صرف میں نے کی۔ دو چار بار ایسا ہونے کے بعد دادا سرے سے اس کھیل کے دوسرے اور اصل حصے کو فراموش کر بیٹھے۔ ایک مرتبہ رات میں لائٹ آئی تو مجھے گھر کے اندر لے گئے اور آواز دے کر سب کو اکٹھا کیا۔ سب آنگن میں جمع ہو گئے۔ دادا نے مجھے آگے کر دیا۔ تین عناوین دیے گئے اور کسی ایک پر میں نے سمع خراشی کی۔ دادی، امی، ابی، کئی عدد چچا، چچی، اور پھوپھی اور پھر عم زاد بھائی بہنوں کی پوری کہکشاں۔ سب اپنے لوگ تھے، میں بہت زیادہ پریشان نہیں ہوا، لیکن یہ اتنا آسان بھی نہیں تھا۔ اس کے بعد ماسٹر شہنواز صاحب کے گھر پر اور عبدالجلیل دادا کی آمد پر بھی یہی ہوا۔ دادا کے کہنے پر ان بزرگوں نے بھی عنوانات دیے اور اور فی البدیہہ تقریر سن کر ہمت افزائی کی۔

اب اس معاملے کو یہیں ختم ہو جانا چاہیے تھا... لیکن دادا تو پھر دادا تھے۔ ایک دن جب وہ جامعۃ الفلاح جانے لگے تو مجھے بھی ساتھ لے لیا۔ میں خوشی خوشی ساتھ ہولیا۔ پاؤں تلے سے زمین اس وقت نکل گئی جب دادا نے باتوں ہی باتوں میں جامعہ کے اساتذہ کے سامنے ''تماشے'' کا اعلان کر دیا۔ میں نے دبے الفاظ میں، ہاتھ کھینچ کر، اور طرح طرح سے دادا کو پھسلانے کی کوشش کی کہ گھر کی بات گھر ہی میں رہ جائے تو اچھا ہے، یوں سر بازار پوتے کی رسوائی سے انھیں کیا حاصل ہوگا۔ اپنے گھر والوں

میں بے پر کی اڑا لینے کو کوئی ٹیلنٹ تھوڑے ہی کہتے ہیں۔ اب ان علماء وفضلاء کے سامنے میں کیا اور کیسے بولوں گا؟ حاضر اساتذہ نے بڑے اشتیاق سے اس بچے کی طرف دیکھا جس کے کان میں تین عنوان ڈال دیے جائیں تو منھ سے ایک عدد تقریر باہر آجاتی ہے۔ کسی استاذ نے تین عناوین تجویز کیے، اور میں نے، مرتا کیا نہ کرتا، کچھ نہ کچھ بول کر جان چھڑائی۔ اساتذہ نے امیدوں سے بڑھ کر حوصلہ افزائی کی، پیٹھ تھپتھپائی، مصافحہ کیا، دعائیں دیں۔ دادا کے چہرے پر ایک عجیب سی چمک تھی جیسے نہ جانے کون سا معرکہ سر کرلیا ہو۔ سب کو خوش دیکھ کر اور سب کی تعریفیں سن کر میں بھی خوش ہوگیا۔ لیکن میری خوشی عارضی تھی۔ ایک استاذ نے جو مصافحہ کیا تو میرا ہاتھ چھوڑا ہی نہیں۔ انھوں نے دادا سے مجھے اپنے ساتھ کلاس میں لے جانے کی اجازت چاہی تاکہ

دیکھا ہے جو کچھ میں نے اوروں کو بھی 'دکھلا دوں'

میرا دل دھک سے ہوگیا۔ ذہن میں سرعت کے ساتھ چند مثبت خیالات آئے: نہیں، یہ نہیں ہوگا؛ دادا مجھے نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیں گے؛ ایک معصوم بچے پر ایک دن میں دو بڑی بڑی آزمائشیں نہیں آسکتیں؛ اور کچھ نہیں تو دادا اتنا تو سوچیں گے ہی کہ بے چارا ابھی ابھی بول کر تھکا ہے... لیکن دادا نے ایک لمحے کے توقف کے بغیر کھلے دل سے محترم استاذ کو اجازت دے دی۔ میں نے دادا پر ایک ملتجیانہ نظر ڈالی کہ یہ تو زیادتی ہے۔ مگر دادا ایسے موقعوں پر بالکل انجان بن جاتے تھے۔ وہ اطمینان سے بات چیت میں مصروف ہوگئے۔ دادا کی 'بے رخی' دیکھ کر میں نے معاملہ اپنے ہاتھوں میں لیا اور دادا سے ذرا دور ہٹ کر محترم استاذ سے، جو ابھی تک میرا ہاتھ تھامے ہوئے تھے، آہستہ سے کہا کہ دادا چلے جائیں گے (یعنی مجھے کلاس میں مت لے جائیں، یہیں چھوڑ دیں، کیونکہ دیر ہوجائے گی اور دادا چلے جائیں گے، پھر میرا کیا ہوگا؟) دادا نے میری یہ دھیمی فریاد بھی سن لی اور بآواز بلند فرمایا، نہیں نہیں میں یہیں بیٹھا ہوں، آپ لوگ اطمینان سے آئیں۔

میں تسلیم کرتا ہوں کہ جو بات بطور کھیل شروع ہوئی، اسے دادا نے ممکنہ ہر قسم کے سامعین سے میرا سامنا کرانے کا بہانہ بنادیا۔ تقریریں تو تیاری کرکے (بمعنی رٹ کے) میں نے پہلے بھی کی تھیں، لیکن ان اچانک تقریروں سے جو حوصلہ اور خود اعتمادی ملی وہ ناقابل بیان ہے۔ میری دروں بیں شخصیت، موقع پر کیے گئے تمام تر احتجاجات کے علی الرغم، اس تربیت بالجبر کے لیے احسان مند ہے۔

لیکن ایک سچائی یہ بھی ہے کہ دادا کی ان ظالمانہ اداؤں سے دل ہر وقت تھرتھر کانپتا رہتا تھا۔ کچھ طے نہیں تھا کہ وہ کب آپ کو تذکیر، تقریر، یا امامت کے لیے آگے کر دیں؛ یا کچھ نہیں تو آنے والے مہمان کے سامنے تر نوالے کی صورت میں پیش کر دیں کہ ''قد کاٹھی پر نہ جائیں، علامہ نے ابھی ابھی خلافت وملوکیت کا مطالعہ کیا ہے، آپ چاہیں تو سوالات کر سکتے ہیں۔'' شاید دادا اس طرح ہمیں دنیا کی ناگہانی آفات سے نبرد آزما ہونے کی ٹریننگ دیا کرتے تھے!

محاذ تعلیم کا فدا کار سپاہی:

میں اس بات کا ذکر کر چکا ہوں کہ دادا سے ان کے بارے میں کچھ جان لینا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ لہٰذا ان کے انتقال کے بعد جامعۃ الفلاح میں جو تعزیتی نشست ہوئی، وہ میرے لیے دادا کی زندگی کے ان بہت سے پہلوؤں کو جاننے کا ذریعہ بنی جن کے بارے میں میری کرید کرید کر جاننے کی تمام تر کوششیں مسلسل ناکام رہی تھیں۔ دادا کے خلوص وللّٰہیت، تقوی شعاری وامانتداری، ایثار وقربانی اور بالخصوص تعلیم کے محاذ پر جانثاری کی جو روداد میں نے سنی، اور سوشل میڈیا پر عام ہونے والی مختلف تعزیتی تحریروں میں پڑھی، اس نے احساس زیاں کو اور گہرا کر دیا۔

ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی

جامعۃ الفلاح کے تصور، تعمیر وترقی میں دادا کا کردار ناقابل فراموش ہے۔ یہ کردار ناظم اور نائب ناظم کی حیثیت سے صرف انتظام وانصرام تک محدود نہیں رہا بلکہ نصاب کی تشکیل میں اور اس کو دور جدید کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے میں بھی نظر آتا ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر اس خواب میں بھی نظر آتا ہے کہ جامعہ کے طلبہ فراغت کے بعد عصری اداروں میں جائیں اور اسلامی خطوط پر اعلیٰ تعلیم وتحقیق میں لوہا منوائیں۔ اس خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لیے ایک طویل مجاہدے کے نتیجے میں جامعہ کا مختلف یونیورسٹیوں سے الحاق ہوا اور آج جامعۃ الفلاح کی تکمیلی اسناد کی بنا پر طلبہ مختلف یونیورسٹیوں سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکتے ہیں۔ اک عظیم خواب کی یہ حسین تعبیر یقیناً اجتماعی کوششوں کا ثمرہ ہے لیکن اس میں دادا کے وژن، ٹیم ورک، اور انتھک زمینی جدوجہد کا کردار کلیدی ہے۔

دادا قسام ازل سے تعلیم کا درد بے دوا لے کر دنیا میں آئے تھے۔ مولانا انیس احمد فلاحی

صاحب کے الفاظ میں علم کی اشاعت کو انھوں نے اپنی زندگی کا نصب العین بنالیا تھا۔ ان کی تعلیمی خدمات جامعۃ الفلاح تک محدود نہیں رہیں۔ مولانا محمد طاہر مدنی صاحب لکھتے ہیں کہ دادا نے دینی تعلیمی تحریک کے تحت علاقے میں دینی مکاتب کا جال بچھا دینے کے لیے بلاتکان جدوجہد کی تھی۔ جامعۃ الفلاح میں بھی انھوں نے نصاب ونظام کی تشکیل میں جہد مسلسل کے علاوہ معیارِ تعلیم کی بلندی کے لیے جی توڑ کوششیں کیں۔ اس ضمن میں مولانا مدنی نے جابجا تعلیمی معائنوں؛ کمزوریوں کو دور کرنے کے لیے تجاویز اور عملی کوششوں؛ نیز معلمین ومعلمات کی فنی ٹریننگ کی طرف توجہ وغیرہ کا خصوصیت سے ذکر کیا ہے۔ لائق اساتذہ کی کہکشاں کو جامعہ کے آسمان کی زینت بنانے کے لیے بھی دادا کی محنتوں کا مختلف بزرگوں نے تذکرہ کیا۔ علاوہ ازیں شبلی کالج، اعظم گڑھ سے بھی ان کی ایک طویل عرصے تک وابستگی رہی۔ مولانا نعیم الدین اصلاحی صاحب بتاتے ہیں کہ علاقے میں تعلیم سے متعلق یہ دادا کی ہمہ جہت خدمات اور ملت کو ابھارنے کی پیہم جدوجہد ہی تھی کہ انھیں ''پوروانچل کا سرسید'' بھی کہا گیا۔

دادا کے نزدیک اصل اہمیت جیسے تیسے تعلیم کی نہیں بلکہ معیاری تعلیم کی تھی۔ مولانا انیس احمد فلاحی صاحب فرماتے ہیں، ''ان کی یہ شدید خواہش رہتی تھی کہ کاش جامعۃ الفلاح کا معیار تعلیم وتربیت اتنا بلند ہوجائے کہ پورے ملک میں اس کو ایک ماڈل کے طور پر پیش کیا جاسکے۔ ان کو اس بات پر سخت کڑھن ہوتی تھی کہ آخر ہمارے طلبہ کے اندر حصولِ علم کی لگن، اس کا جذبہ اور اس کا شوق کیوں نہیں پیدا ہو پارہا ہے۔ اساتذہ کرام اس ناچیے سے ان کے جذبے کو مہمیز لگانے میں آخر کیوں ناکام ہورہے ہیں؟'' معیار پر یہ توجہ صرف اداروں کے لیے نہیں والدین اور طلبہ میں بھی ناگزیر ہے، دادا کے مطابق بالخصوص طلبہ میں اس شعور کی آبیاری کی جانی چاہیے۔ لہٰذا دادا ہم سبھی کو تخصص اور مہارت کے لیے ابھارتے تھے۔ یہ بات کبھی کبھی بہت جوشیلے انداز میں سمجھاتے تھے، مثلاً ایک مرتبہ میں نے انھیں اپنے ایک ہم مشرب سے یہ کہتے ہوئے سنا، ''میں تو یہ کہتا ہوں کہ جس فیلڈ میں جاؤ اس میں کمال حاصل کرو، رقص کرنا ہو تو اتنا اچھا کرو کہ تم سے بہتر دنیا میں کوئی رقاص نہ ہو، کسی کو اعلیٰ ترین درجے کا رقص سیکھنا ہو تو وہ مجبور ہو کہ تمہارا دروازہ کھٹکھٹائے۔'' کوئی ناواقف حال اس ادبی جملے کے حوالے سے بال کی کھال نکالنے پر آمادہ ہو تو جادوگر کی ٹوپی سے خرگوش کی طرح یہ نتیجہ برآمد کرسکتا ہے کہ دادا علم نافع وغیر نافع کی

اسلامی تقسیم کے قائل نہ تھے بلکہ بہت سے 'ماڈرن' مسلمانوں کی طرح اسلامی و غیر اسلامی کا لحاظ کیے بغیر صرف تعلیم پر توجہ دیتے اور دلاتے تھے۔ صورتحال کی اس سے زیادہ غلط ترجمانی ممکن نہیں۔ اس ادبی جملے کا سارے کا سارا زور ''کمال'' پر ہے۔ اور رہی بات تعلیم کی غیر اسلامی شاخوں کی تو اس بابت تحریک اسلامی کے عزیمت بھرے ماحول میں دادا کی ایسی تربیت ہوئی تھی کہ وہ وکالت اور اس قبیل کے دیگر پیشوں سے بھی اعزہ کو دور ہی رکھنا چاہتے تھے کہ ان علوم کی تحصیل کے بعد فرد باطل نظام وقوانین کی چاکری اور غیر اسلامی اعمال میں ملوث ہونے پر خود کو مجبور پاتا ہے۔ ابی بتاتے ہیں کہ علی گڑھ میں تعلیم کے زمانے میں ایک مرتبہ انھیں ایل ایل بی کرنے کا خیال آیا، لیکن بات دادا تک پہنچی تو انھوں نے ابی سے صاف صاف کہہ دیا کہ ''میرے پاس تم کو وکیل بنانے کے پیسے نہیں ہیں۔'' ابی بتاتے ہیں کہ ایل ایل بی کرنے میں کوئی ایسا اضافی خرچ نہیں ہو رہا تھا، جو کیمسٹری سے ایم ایس سی کرنے میں نہ ہو رہا ہو، لہٰذا دادا کی بات کا مطلب صرف اتنا تھا کہ: تم وکالت پڑھو اور وکیل بنو، یہ میں نہیں چاہتا اور اگر یہ کرنا ہے تو خود کرو، اس میں میرے کسی تعاون کی امید مت رکھو۔

دادا کے مطمحِ نظر یہ بات رہتی تھی کہ مسلمان بچے علم وفکر کے اعلیٰ سے اعلیٰ مدارج طے کریں لیکن اپنی اسلامی شناخت کا سودا نہ کریں۔ صرف تہذیبی طور پر مسلمان نہ رہیں بلکہ شعوری ونظریاتی وعملی مسلمان بنیں۔ علم کی مختلف شاخوں کو الٰہی نظریہ اور اسلامی منہج تحقیق کے ذریعہ فتح کریں۔ یہ کام اتنے بڑے پیمانے پر ہو کہ ایک بار پھر مسلمان اہل علم، دانشور، فلسفی وسائنسداں علمی افق پر چھا جائیں اور وہ قومیں، جو علم وتحقیق کے میدان میں آج غالب ہیں، وہ ایک بار پھر علمی وفکری سطح پر مسلمانوں کی اتباع کریں۔ شاید ان کا یہ عظیم خواب ہی تھا جس کی وجہ سے دادا ہمیشہ اس بات پر زور دیتے تھے کہ علمی میدان میں ہم اپنے مقام پر کبھی مطمئن نہ ہوں بلکہ ہر آن اپنی پرواز کو مزید اونچا کرنے پر توجہ مرکوز رکھیں کہ:

ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں

چنانچہ دادا ہمیشہ تعلیمی میدان میں تخلیقی مسابقت پر زور دیتے۔ ان کا ماننا تھا کہ علمی میدان میں نظر ہمیشہ ان پر ہونی چاہیے جو ہم سے آگے ہوں، اور لگاتار خوب سے خوب تر کی جستجو ہونی چاہیے، اس سے صلاحیتوں میں زنگ نہیں لگتا اور سیکھنے کی امنگیں ہمیشہ برقرار رہتی ہیں۔ چنانچہ اگر کسی کی کلاس

میں دوسری یا تیسری پوزیشن آتی تو دادا پوچھتے کہ جس کی پہلی پوزیشن آئی ہے کیا اس کے تین ہاتھ ہیں؟ جس سے پوچھتے وہ بے چارا ہڑبڑا کر کہتا کہ نہیں تین ہاتھ کس کے ہوتے ہیں؟ پھر پوچھتے، تب چار آنکھیں ہوں گی؟ جواب ملتا کہ نہیں دو ہی ہیں۔ پھر معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ پوچھتے، سر میں سینگ تو ضرور لگے ہوں گے؟ جواب دینے والا بھی مسکرائے بغیر نہ رہتا مگر ادب سے کہتا کہ نہیں۔ اب دادا کہتے تب اس کی کیسے اول پوزیشن آ گئی، تمہاری کیوں نہیں آئی؟ اس بات کو خراب لہجے اور دل دکھا دینے والے انداز میں بھی کہا جا سکتا تھا، لیکن دادا اتنے پیار سے سمجھاتے ہوئے کہتے تھے کہ فرد میں احساس کمتری کا خفیف سا جوہر بھی ہوتا تو کافور ہو جاتا اور وہ نئے سرے سے محنت اور مسابقت کے لیے تیار ہو جاتا۔

ایسا نہیں ہے کہ پہلی پوزیشن پر دادا کو قرار آ جاتا تھا۔ نہیں، اس وقت بھی دادا اطمینان کے سانس پر خواب خرگوش کا حکم لگاتے تھے۔ اگر آپ کی پہلی پوزیشن آئی ہو تو دادا فیصد معلوم کرتے اور پھر مثلاً پچھلے سال یا پچھلے امتحان کا فیصد معلوم کرتے، حالیہ نتائج کا فیصد کم ہوتا تو توجہ دلاتے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ترقی ہونی چاہیے تنزلی نہیں یا ایک دوسرا طریقہ یہ تھا کہ پچاسی فیصد پر پوچھتے کہ نوے کیوں نہیں ہیں، اگلے امتحان میں اس کی کوشش ہونی چاہیے۔ دادا کو ستانے کے لیے اگر میں کبھی کہتا کہ دادا پہلی پوزیشن تو ہے، اب اور کیا چاہیے؟ جس کی دوسری پوزیشن ہے اس میں اور مجھ میں ایک دو نہیں (مثلاً) ساٹھ نمبر کا فرق ہے۔ تو دادا بہت سنجیدہ لہجے میں بٹھا کر سمجھاتے کہ اگر کوئی برابر والا نہیں دکھ رہا ہے تو عقلمندی اپنا ہدف خود طے کرنے میں ہے، مسابقت میں کوئی آس پاس نظر نہ آئے تو مسابقت اپنے آپ سے ہونی چاہیے۔ زندگی میں کچھ بڑا کرنا ہے تو لازم ہے کہ اندھوں میں کانا راجا بننے پر کبھی راضی نہ ہوا جائے، وغیرہ وغیرہ۔

اصلاح و تربیت کا علمبردار:

یقیناً دادا تعلیم کو بہت سے مسائل کا حل تصور کرتے تھے۔ محنت، مسابقت، معیار، اور اختصاص پر توجہ دلاتے تھے۔ لیکن وہ نری تعلیمی ترقی اور ڈگریوں کے انبار کے قائل نہ تھے، بلکہ طلبہ کی اسلامی تربیت کو بھی تعلیم کا جزو لاینفک سمجھتے تھے۔ اسلامی تربیت پر اس توجہ کا اثر گھر پر بھی صاف محسوس ہوتا تھا۔ یہاں چراغ تلے اندھیرا نہ تھا بلکہ دادا، اپنی تمام تر تعلیمی و تحریکی مصروفیات کے باوجود، گھر

والوں کے معمولات پر نظر رکھتے تھے۔ یہ نظر اتنی گہری ہوتی کہ بسا اوقات ایسا گمان ہوتا کہ دادا کو دلوں کے اندر جھانک لینے کی صلاحیت ودیعت کی گئی ہے۔ اس کا اندازہ ایک مرتبہ مجھے اس وقت ہوا جب دادا نے ایک صاحب سے میرا تعارف کچھ یوں کرایا، ''یہ لڑکا ہندو کالج میں پڑھتا ہے'' پھر میرے چہرے کی طرف اشارہ کر کے، ''یہ وہ چہرہ ہے جس کی آج تک استرے سے ملاقات نہیں ہوئی ہے۔'' اس مختصر سے دوٹوک تعارف کے پورے پس منظر سے میں نہ اس وقت واقف تھا نہ اب ہوں، لیکن یہ واضح تھا کہ دادا کے پیش نظر ان صاحب کی اصلاح تھی۔ دادا اصلاحِ احوال کے لیے اسی طرح گرم لوہے پر ہتھوڑا مارنے پر یقین رکھتے تھے۔ البتہ میں متعجب اس بات پر تھا کہ آخر یہ بات دادا جانتے کیسے ہیں؟ بات صرف ''ملاقات نہیں ہوتی ہے'' کی ہوتی تو مجھے تعجب نہ ہوتا کیونکہ چہرے پر ایک نظر ڈال کر یہ بات کہی جاسکتی تھی، لیکن ''آج تک نہیں ہوئی ہے'' کے الفاظ اور دادا کے انداز میں جو زور اور ہر قسم کے استثنیٰ کی نفی تھی، اس نے مجھے حیران کر دیا۔ قلبی نہیں مگر مکانی فاصلوں کے اعتبار سے تو میں ہمیشہ دادا سے دور رہتا تھا، پھر اس موضوع پر کبھی بات بھی نہیں ہوئی، یہ بھی امید نہیں کہ دادا بغیر سوچے سمجھے اور جانے بوجھے کوئی دعویٰ یونہی کر دیں گے، تو دادا نے آخر ایسا کیا نوٹس کیا یا کس سے معلومات حاصل کیں کہ بانگ دہل یہ دعویٰ کر دینے میں انھیں کوئی باک نہیں ہوا۔

یہ صرف میرا معاملہ نہیں تھا، دادا سبھی گھر والوں پر ایسی ہی نظر رکھتے اور ان کے احوال سے ایسے ہی باخبر رہتے تھے۔ بچوں کی عادات واطوار پر خصوصی توجہ مبذول کرتے اور صحبتِ صالح پر زور دیتے۔ جن کی تعلیم جاری ہوتی ان کی تعلیمی ترقی کو نگاہ میں رکھتے؛ بلا کر سوال پوچھتے؛ کوئی بات سمجھ میں نہ آئے تو سمجھانے اور پڑھانے لگتے۔ اسی طرح نمازوں کا اہتمام خود بھی کرتے اور گھر پر بھی نظر رکھتے کہ نمازوں سے کسی قسم کی غفلت نہ ہونے پائے۔ اس ضمن میں بالخصوص بچوں سے وقتاً فوقتاً پوچھتے بھی رہتے، کسی قسم کی غفلت پر ٹوکتے اور نصیحت کرتے۔ روزانہ یہ معمول بنا رکھا تھا کہ فجر کے لیے گھر میں سب کو اٹھاتے۔ اس دور میں جب موبائل فون نہیں ہوا کرتے تھے، اور الارم گھڑیاں ہر کسی کے پاس نہیں ہوتی تھیں، دادا کا دروازہ کھٹکھٹانا عملی طور پر فجر کے الارم کی حیثیت رکھتا تھا۔

ماسٹر شاہنواز صاحب کے مطابق دادا عزیزوں اور رشتہ داروں کے درمیان دینی وتحریکی شعور کی آبیاری کے لیے خصوصی محنت کیا کرتے تھے۔ انھیں پڑھنے کے لیے کتابیں دیا کرتے، سوالات کے

ذریعہ ذہنی کشمکش میں مبتلا کرتے، مطالعہ کی ترغیب دلاتے، سوچنے پر مجبور کرتے، مطالعے کے درمیان رہنمائی کرتے، تحریک کا تعارف کراتے اور تحریک سے قریب کرتے۔ اوپر ذکر ہوا کہ دادا کتابیں دیتے نہیں تھے لٹاتے تھے۔ یہ سخاوت کچھ مجھ تک محدود نہیں تھی۔ دادا بچوں سے لے کر بڑوں تک سبھی کو ان کی عمر، مزاج، علمی سطح اور دلچسپیوں کے اعتبار سے اسلامی لٹریچر فراہم کیا کرتے تھے۔ بڑی بہنیں بتاتی ہیں کہ بچپن میں دادا نے انھیں بھی کئی چھوٹی چھوٹی کتابیں دی تھیں، جن میں سے مائل خیرآبادی کی ''بشریٰ کے خطوط'' کا میں اکثر ذکر سنتا رہا۔

لوگوں کی اصلاح و تربیت کے لیے دادا خوب مشقتیں اٹھاتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ ممبرا میں دادا نے مجھے خدا حافظ کے بجائے، ملاقات کے اختتام یا کسی کو رخصت کرتے وقت بھی سلام کرنے اور کچھ دعا دینی ہی ہے تو فی امان اللہ یا اللہ حافظ کہنے کی نصیحت کی۔ اپنی عادت سے مجبور میں نے خوب بحث کی کہ خدا حافظ میں ایسا بھی کیا غلط ہے۔ یہ سلسلہ کچھ دن چلا۔ بحث کے دوران میں زبان و بیان سے لے کر عرف عام تک کے دلائل نہ جانے کہاں کہاں سے گھسیٹ لاتا۔ دادا جب تک مناسب لگتا سمجھاتے اور پھر میرے 'دلائل' کے جواب میں خاموشی اختیار کر لیتے۔ لیکن موقع دیکھ کر پھر ٹوک دیتے، میں پھر وہی سب باتیں دہراتا اور دادا پھر کچھ دیر کوشش کر کے خاموش ہو جاتے۔ ایک دن دادا غالباً پھوپھی کے یہاں جانے لگے تو دروازہ بند کرتے وقت میں نے مسکرا کر اور ذرا جتا کر خدا حافظ کہا، لیکن دادا نہ جانے کس سوچ میں گم تھے، انھوں نے میری شرارت پر دھیان نہیں دیا، اور چلے گئے۔ یہ ایشو میرے لیے بالکل بھی اہم نہ تھا۔ تبادلۂ خیال اور بحث و مباحثہ جو کچھ ہوا صرف اس وجہ سے ہوا کہ دادا کی طرف سے کبھی اظہار رائے اور اختلاف پر پابندی نہیں لگائی گئی، ان سے ہر بات پہ گفتگو بشمول نوک جھونک کے ہو سکتی تھی، اور ہوتی تھی۔ خیر، دادا چلے گئے، اور میں اپنے کاموں میں لگ گیا۔ بمشکل چار پانچ منٹ ہوئے ہوں گے کہ گھنٹی بجی۔ میں نے دروازہ کھولا۔ دادا سامنے تھے۔ ''کیا ہوا دادا؟ کچھ بھول گئے؟'' میں نے تھوڑا پریشان ہو کر پوچھا۔ دادا نے سلام کیا۔ میں نے جھینپ کر جواب دیا اور پھر اپنا سوال دہرایا۔ دادا نے سوال کو پھر نظر انداز کر دیا اور اپنی نصیحت دہرائی کہ میں لوگوں کو رخصت کرتے ہوئے بھی سلام کروں اور خدا حافظ کے بجائے اللہ حافظ کہوں۔ میں نے کہا وہ تو ٹھیک ہے، لیکن یہ بتائیں کہ اچانک کیا مسئلہ ہو گیا؟ دادا کچھ بولے بغیر واپس جانے لگے تو میں نے

پوچھا، ''آپ بس مجھ سے یہی بولنے آئے تھے؟'' دادا نے کہا، ہاں۔ میں نے سر پیٹ لیا۔ دادا شاید اسی بات کے لیے پریشان تھے۔ نہ جانے کتنی دیر شش و پنج میں رہے۔ پتہ نہیں کہاں پہنچ کر فیصلہ کیا کہ لوٹ کر نصیحت کرنی چاہیے اور پھر دو منزل چڑھ کر مجھے اتنی سی تلقین کرنے آئے تھے۔ دادا چند سیڑھیاں اتر چکے تھے کہ میں نے زور سے سلام کیا، اللہ حافظ کہا اور کہہ دیا کہ میں نے ان کی بات مان لی ہے۔ دادا رکے نہیں، لیکن میں نے دیکھ لیا کہ وہ بہت خوش ہیں اور مسکرا رہے ہیں۔ اب جاتے وقت وہ بالکل بھی پریشان نہیں لگ رہے تھے۔ اس معمولی سی اصلاح کے لیے دادا نے جو یہ مصیبت جھیلی اس سے مجھے پتہ چلا کہ ہم میں کسی بھی درجے کے قابل اصلاح وصف کا وجود انھیں کیسا بیتاب کر دیتا تھا۔ اور اخیر کی بے اختیار مسکراہٹ جہاں ان کی محبتوں کی غماز تھی وہیں اس بات کی عکاس بھی تھی کہ تربیت کے میدان کی معمولی کامیابیاں بھی انھیں کیسی سچی خوشی اور اطمینان بخشتی تھیں۔

اسلام کا حرکی تصور دادا کے دل دماغ اور سیرت و کردار میں رچا بسا تھا۔ اللہ حافظ والی اس سرگزشت سے یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط ہوگا کہ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں کے پیچھے پڑ کر تربیت کے نام پر یک رنگی یا regimentation کے قائل تھے۔ درحقیقت وہ دین کے معاملات میں اصولوں کو دانتوں سے پکڑ لینے اور فروعی معاملات میں توسع کے حامی تھے۔ ان کی عمومی روش یہی تھی چنانچہ وہ رفع یدین کرنے لگے تھے لیکن میں نے کبھی اس بارے میں انھیں کسی کو ٹوکتے یا کسی سے بحث کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ ایک مرتبہ مسجد میں ایک صاحب نے مجھے ٹوپی نہ پہننے پر ٹوک دیا، اس پر دادا نے دو ایک اصولی جملے کہے اور مجھے امامت کے لیے آگے کر دیا۔ دادا ایک عملی آدمی تھے، جانتے تھے کہ مسلم معاشرے میں دین میں ترجیحات کے حوالے سے جو متعدد غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں، ان کا تدارک صرف احکام کے بیان سے نہیں بلکہ عملی اقدام سے ہی ہوسکتا ہے۔ لہٰذا مجھ سے اسی حال میں نماز پڑھوا کر دادا نے معترض صاحب و دیگر مقتدی حضرات کی تربیت کا سامان کیا۔ لیکن اس معاملے میں بھی دادا کے موقف میں ایک نایاب توازن دیکھنے کو ملتا ہے۔ کسی اور موقع سے، مسجد ہی میں دادا نے مجھ سے قریب ہو کر میرے کان میں یہ سوال پوچھا: ٹوپی پہننا گناہ تو نہیں ہے؟ جب میں نے نفی میں سر ہلایا تو اسی طرح سرگوشی کے انداز میں کہا، ''یقیناً ٹوپی فرض نہیں ہے لیکن اللہ کے حضور حاضر ہونے پر اگر یہ اہتمام کیا جائے تو مجھے اس میں کوئی نقصان نظر نہیں آتا، کیا خیال ہے؟'' یہ دادا کی تربیت کا انداز تھا۔ معاملہ اصولوں کا ہو تو بے لچک

موقف؛ فروعات کا ہوتو ہلکے پھلکے سوال، نرم لہجہ، نصیحت کے وقت بھی (استادانہ نہیں) طالب علمانہ انداز، کسی چیز کو زبردستی نافذ کردینے کے بجائے طبیعت میں اندر سے تبدیلی کی کوشش۔ دین میں ترجیحات کے حوالے سے ہرطرح کی انتہاپسندی سے دور ایسی بصیرت افروز روش یقیناً قابل تقلید ہے۔

دادا کے ذہن میں یہ بات صاف تھی کہ دین کا حرکی تصور روحانیت کی نفی نہیں کرتا بلکہ اس میں مقصدیت پیدا کرکے اسے بامعنی بنادیتا ہے۔ لہٰذا ان کی حرکیت وفعالیت انھیں توسع کی طرف تو لے گئی مگر تجدد کی طرف نہیں۔ زندگی بھر وہ اطاعت الٰہی اور اتباع رسولؐ کے پیکر بنے رہے۔ دوسروں کے لیے توسع کی پالیسی اختیار کرتے لیکن خود چھوٹی چھوٹی باتوں میں اتباع سنت کی کوشش کرتے۔ ممبرا میں ایک مرتبہ ہم بھائی بہنوں میں سے کسی پر یہ انکشاف ہوا کہ دادا وضو کے بعد تولیے کا استعمال نہیں کرتے ہیں۔ ہم سب نے اسے الگ الگ آزما کر دیکھا اور خوب محظوظ ہوئے، دادا باہر سے آتے اور ہاتھ منھ دھوتے تو تولیہ پیش کیے جانے پر لے لیتے لیکن وضو کرکے نکلتے تو تولیہ دیے جانے پر مسکرا کر منع کردیتے۔ پوچھنے پر بس اتنا کہتے کہ محض ہاتھ منھ دھونا ایک الگ بات ہے اور وضو کرنا ایک الگ بات۔ یہ ہمارے لیے بڑا دلچسپ رہا لیکن اس کی حقیقی وجہ معلوم نہ ہوسکی۔ پچھلے سال جب میں نے اہلیہ کے ساتھ صحیح بخاری کے اجتماعی مطالعے کا سلسلہ شروع کیا تو حضرت میمونہؓ سے روایت کردہ ایک حدیث نظر سے گزری جس میں نبی کریمؐ کے غسل کرنے اور اس کے بعد کپڑا (تولیہ/رومال) پیش کیے جانے پر اس کا استعمال نہ کرنے کا ذکر ہے۔ دادا نے غالباً یہ حدیث کہیں پڑھی ہوگی۔ معاملہ کسی شرعی حکم یا فرض وواجب کا نہیں ہے، اور یہ بات وہ جانتے ہی ہوں گے، لیکن نبیؐ سے محبت اور ان کی اتباع کا شوق ایسا تھا کہ دادا بھلا کہاں چوکنے والے تھے؟

دادا تحریک اور تعلیم وتربیت کے محاذ پر ہر قربانی کے لیے خود بھی تیار رہتے اور اپنے اہل وعیال کی تربیت بھی انھی خطوط پر کرتے۔ دسویں کے بعد جب AITIPT کے تحت اعلیٰ تعلیم کے لیے میرا سلیکشن ہوا، تو امی اور ابی پس وپیش میں تھے کہ بچے کو گھر سے اتنی دور کیسے بھیج دیں۔ ایک آدھ جان پہچان والوں نے پوری اسکیم پر ہی کئی سوالیہ نشان کھڑے کردیے تھے۔ لیکن دادا نے تحریک کی اس تعلیمی پہل پر اعتماد کیا۔ دادا کے اعتماد پر اعتماد کا نتیجہ تھا کہ امی اور ابی مجھے، جس نے کسی بڑے کا ہاتھ تھامے بغیر سڑک بھی پار نہیں کی تھی، گھر سے پندرہ سو کلومیٹر دور بھیج دینے پر تیار ہوگئے۔ دادا کے نزدیک حصولِ علم

کے لیے ہر قربانی دی جاسکتی تھی۔ ایک موقع پر انھوں نے یہ مشورہ دیا تھا کہ اگر تعلیم میں حرج کا اندیشہ ہو تو میں بڑی بہنوں کی شادی میں بھی شریک ہونے کی کوشش نہ کروں۔ اس کی ضرورت نہیں پڑی اور نکاح گرمیوں کی چھٹیوں میں ہوئے لیکن اس سے دادا کے نزدیک تعلیم کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے۔

دہلی منتقلی کے بعد دادا پہلے سے زیادہ رغبت کے ساتھ تعلیم کے مختلف مراحل کا حال معلوم کرتے تھے۔ کسی تعلیمی سنگ میل کے عبور ہونے پر ایسا لگتا کہ دادا مجھ سے زیادہ خوش ہیں۔ ایم فل میں جب میں نے سماجی انقلابات کے اسلامی و مارکسی تصورات کے تقابلی مطالعے کا موضوع چنا تو دادا کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔ پی ایچ ڈی کے لیے جب میں نے وژن اور تشدد کے دو نکات پر مرکوز ہو کر سید مودودیؒ، لینن اور گولوالکر کے تقابلی مطالعے کا موضوع منتخب کیا تو دادا نے عصری معنویت کے حامل ایک بامقصد موضوع کے تعین پر مبارکباد دی۔ ہر بار ملاقات پر تحقیقی کام کی پیش رفت معلوم کرتے، خوش ہوتے، اور تحقیق کا حق ادا کرنے کی نصیحت کرتے۔

دادا انتہائی باریک بینی کے ساتھ تجزیہ کرتے تھے۔ جن باتوں کی طرف عموماً دھیان نہیں جاتا، وہاں ان کی توجہ مرکوز ہو جاتی تھی۔ ایک مرتبہ بلریا میں دادا میرا ایک آرٹیکل پڑھ رہے تھے جو 'دی کمپینین' میں چھپا تھا۔ کمرے میں ابی بھی تھے اور حسب دستور میں بھی۔ دادا نے انگریزی کے ایک لفظ کا مطلب پوچھا جو اپنے مضمون میں میں نے استعمال کیا تھا۔ یہ سوال انھوں نے ایسی خوشی سے کیا جیسے انگریزی پڑھانے کی ساری محنت وصول ہوگئی ہو۔ یہ دادا کی عادت تھی۔ وہ طالب علمانہ سوال سب کے سامنے کرتے اور اگر کوئی اصلاح کرنی ہوتی تو، چاہے تلفظ جیسی معمولی اصلاح ہی کیوں نہ ہو، اکیلے میں کرتے اور اس وقت بھی انداز تحکمانہ نہیں طالب علمانہ ہی ہوتا کہ یہ بات صحیح ہے یا غلط دیکھ لیجیے گا یا مجھ کو تو اتنا ہی آتا ہے وغیرہ۔ میں نے دبے لہجے میں اس لفظ کا مطلب بتا دیا۔ ابی نے موقع دیکھ کر وہ بات کہی جو وہ اور متعدد دوسرے لوگ بھی مجھ سے کہہ چکے تھے کہ آسان لکھا کرو، قارئین کی سمجھ میں ہی نہ آئے کہ کیا لکھا ہے تو پھر لکھنے کا فائدہ کیا ہے؟ میں نے کوئی جواب نہیں دیا، اس بات سے کیسا اختلاف کہ مضمون نگار کی بات قاری کو سمجھ میں آنی چاہیے۔ لیکن دادا نے مجھے ایک دوسری انتہا سے خبردار کرتے ہوئے کہا، ''علمی نثر جیسے لکھی جاتی ہے ویسے ہی لکھی جائے گی۔ ہر لفظ کا اپنا موقع محل ہوتا ہے۔ جب معنی اسی لفظ سے ادا ہو رہے ہوں تو آسانی کے چکر میں تحریر کے معیار سے سودا تھوڑے ہی کیا جائے گا۔ لکھتے

رہو۔معلوم پڑنا چاہیے کہ آرٹیکل ہندو کالج کے مسلمان اسکالر نے لکھا ہے۔'' یہاں واضح رہے کہ دادا عام فہم تحریر کے خلاف نہیں تھے، بلکہ تحریر کو آسان بنانے کے اس سراب سے متنبہ کررہے تھے کہ جس کا دیوانہ وار تعاقب کیا جائے تو نہ فکر وتحقیق کی گہرائیوں میں اترنا ممکن رہے اور نہ کسی مقالے کے علمی معیار کو برقرار رکھنا۔

مردخودآگاہ وخدامست:

دادا اکلوتے بیٹے تھے۔ناز ونعم میں پلے تھے۔لیکن تحریک اسلامی سے شناسائی کے بعد زندگی میں سادگی سرایت کرگئی۔اسی کا اثر تھا،مولانا عمران فلاحی بتاتے ہیں، کہ گھوڑے سے سائیکل پر آ گئے۔ نفاست،صفائی اور ستھرائی اپنی جگہ لیکن لباس کے معاملے میں بھی سادگی پسند رہے۔میں پیدا ہوکر جوان ہوگیا لیکن دادا کی وہ دو تین شیروانیاں، جو نہ جانے کب کی سلی ہوئی تھیں، بوڑھی نہ ہوئیں۔

دادا ممبرا آتے یا میں بلریا جاتا، ہمارا چوبیسوں گھنٹوں کا ساتھ طے تھا۔رات میں میرا بستر انھی کے پاس بچھتا۔ایسے میں میں دادا کی راتوں کے معمولات کا شاہد بھی ہوں۔رات میں جب کبھی آنکھ کھلتی،دادا مجھے بیدار ملتے۔تہجد کی نماز پڑھ رہے ہوتے،تلاوت کررہے ہوتے،کسی کتاب کا مطالعہ کررہے ہوتے، یا ورزش کررہے ہوتے۔لیکن مجھے ہمیشہ فجر ہی میں جگاتے تھے۔ بلکہ مجھے کیا، سبھی کو جگانے کا ایک معمول بنا رکھا تھا۔کسی کو نماز میں کوتاہی کرتے دیکھتے تو خفا ہوتے۔

دادا کو مسجد سے بہت محبت تھی۔عموماً جماعت سے بہت دیر پہلے، بلکہ بسا اوقات اذان سے بھی پہلے مسجد پہنچ جاتے اور ذکر واذکار اور تلاوت میں مشغول رہتے۔جب مجھے فجر میں اٹھاتے تو میں گنہگار گھڑی دیکھ کر احتجاج کرتا کہ دادا ابھی تو بیس منٹ باقی ہیں؛ کیونکہ میرے ذہن میں یہ لائحہ عمل ہوتا کہ نماز سے پانچ منٹ پہلے اٹھ کر تیر کی طرح واش روم میں گھسوں،ضروریات سے فارغ ہوکر گولی کی طرح مسجد پہنچوں، اور پھر راکٹ کی رفتار سے سنت پڑھ کر صف میں شامل ہو جاؤں۔اور دادا مجھ سے اس دستور العمل کی توقع کرتے کہ انسان اٹھے، دعائیں پڑھے،ضروریات سے فارغ ہو،تلاوت کرے،اطمینان سے سنت پڑھے اور پھر میانہ روی سے مسجد کی طرف روانہ ہو اور مسجد میں جماعت سے کچھ دیر قبل بیٹھ کر ذکر واذکار میں مشغول رہے۔ہمارے اقدار میں اس تفاوت کا نتیجہ یہ ہوتا کہ عموماً مجھے

نیکوکار و صالحین جیسا بننا پڑتا اور کبھی کبھی تہجد گزار دادا مجھ گنہگار کی طرح مسجد میں نسبتاً تاخیر سے حاضر ہوتے۔

بلریا ہی میں گھر کے قریب کھیتوں کی طرف دادا نے ایک مسجد مسجد بلال کے نام سے تعمیر کرائی۔ مسجد کے لیے صرف زمین نہیں وقف کی، بلکہ دل و جان سے خود کو وقف کر دیا۔ تعمیر اور دیگر امور کی نگرانی کی۔ انتظامات سنبھالے۔ گاہے بگاہے امامت بھی کی۔ مسجد کے لیے کتابوں کا انتظام کیا۔ لوگوں کو بالخصوص بچوں اور نوجوانوں کو مسجد سے جوڑا۔ زیادہ تر وقت مسجد میں ہی گزارتے۔ کہا جا سکتا ہے کہ اخیر میں گھر سے زیادہ مسجد میں رہنے لگے تھے۔ کیسی ہی بیماری یا کمزوری و نقاہت ہو، اذان سنتے ہی چاہتے تھے کہ مسجد کی طرف چل پڑیں۔ شدید بیماری کی حالت میں بھی بہت اصرار کر کے روکنا پڑتا، اکثر و بیش تر ان گزارشات کو نظر انداز کر کے مسجد کے لیے نکل کھڑے ہوتے، نہیں جا پاتے تو بے چین رہتے تھے۔ بڑھاپے کی وجہ سے جب پیدل جانے کی سکت نہیں رہی تو ایک مدت تک چچا کے پیچھے بیٹھ کر موٹر سائیکل سے مسجد جاتے رہے۔ اللہ کے گھر سے دادا کا تعلق مثالی اور قابل رشک تھا۔

اجتماعی زندگی میں دادا کی امانتداری ضرب المثل رہی۔ ایک بار میرے پنسل باکس میں کچھ پیسے دیکھ کر ابی نے دریافت کیا کہ یہ کیسے پیسے ہیں؟ میں نے بتایا کہ کلاس کے طلبہ نے (اجتماعی کاموں کے لیے) جمع کیے ہیں، گروپ لیڈر کی حیثیت سے میرے پاس ہیں۔ ان پیسوں میں خلط ملط کا کوئی امکان نہ تھا، میرے پاس پائی پائی کا حساب تھا، اور ذمہ داری کا احساس بھی۔ لیکن پھر بھی ابی نے امانتداری کی نصیحت ضروری سمجھی، اور یہ احساس دلایا کہ یہ چند روپے ہیں مگر ذمہ داری بہت بڑی ہے۔ نصیحت کرتے ہوئے ابی نے دادا کی مثال پیش کی اور بتایا کہ انھیں بیت المال کا ایسا پاس تھا کہ نشستوں میں عموماً اپنے پاس بھیلی (گڑ) رکھا کرتے اور وہی کھا کر پانی پی لیتے، اس بات کی کوشش کرتے کہ جامعہ سے چائے اور بسکٹ لینے کی بھی نوبت نہ آئے۔ ایسا کون کرتا ہے؟ کیا واقعی ایسا ہوتا ہوگا؟ کیا اس درجہ احتیاط ممکن بھی ہے؟ خلفائے راشدین وغیرہ کی بیت المال کے تئیں احتیاط تو تاریخ کا حصہ ہے، تعزیتی نشست میں جب ساتھ کام کر چکے ذمہ داران و اساتذہ کی زبانی ایک کے بعد ایک دادا کی امانتداری کا حال سنا تو یقین آیا کہ ہر دور میں اسلام کی زریں تاریخ کے مختلف پہلوؤں کو جینے والے دنیا میں موجود ہوتے ہیں۔ دادا بھی انھی میں سے ایک تھے۔ جیسے آگ سے بچا جاتا ہے ویسے وہ بیت المال

کے مال سے بچتے تھے۔ سفر درپیش ہوتا تو اپنے ساتھیوں کا خیال رکھتے تھے لیکن خود یونہی گزارا کر لیتے یا ممکن ہوتا تو اپنی جیب سے خرچ کرتے۔ کاش بیت المال کو یونہی مال یتیم سمجھا جاتا رہے!

دادا مال کے ساتھ ساتھ صحت کو بھی شعوری طور پر امانت سمجھتے تھے۔ صحت کا بھرپور خیال رکھتے تھے۔ جلد سونے اور بہت جلد اٹھنے کی عادت شروع سے رہی۔ صبح اٹھ کر جہاں تلاوت و تہجد کا معمول تھا وہیں ورزش اور چہل قدمی بھی کرتے تھے۔ الٹی سیدھی بالخصوص بازاری چیزوں کو کھانے کے قائل نہ تھے؛ دسترخوان پر پھل، سبزی، انڈا یا مچھلی جو بھی ہوتا اس کے طبی خواص اور صحت پر اثرات بتاتے اور جس چیز کو کھانا مجھے جتنا ناگوار ہوتا اس کے اتنے ہی زیادہ قصیدے پڑھتے اور خوب مزے لے لے کر کھاتے۔ میں نہیں جانتا کہ انھیں پھل اور سبزیاں مرغوب تھیں یا نہیں، لیکن یہ جانتا ہوں کہ وہ غذا کی ہر حلال اور صحت افزا جنس سے استفادے کے قائل تھے۔ لمبے لمبے دسترخوانی محاضرات پر مجھے کوئی خاص اعتراض نہ تھا، لیکن مسئلہ سنگین تب ہو جاتا جب دادا ان غذاؤں کو میرے منھ میں ڈال کر، میرے گلے سے گزار کر، میرے پیٹ میں اتارنے پر تل جاتے تھے۔ اکثر تو اپنے نخروں اور مختلف ترکیبوں سے میں بچ جاتا لیکن مجھے اقرار کرنا ہوگا کہ کبھی کبھی مجھے بھی ہتھیار ڈالنے پڑتے۔ چنانچہ تاریخ گواہ ہے کہ کئی ابلے ہوئے انڈے میں نے ان کے اصرار پر بادل ناخواستہ کھائے ہیں۔

دادا دن میں صرف دو دفعہ کھاتے تھے۔ ایک مرتبہ صبح دس ساڑھے دس بجے اور دوسری مرتبہ مغرب کے آدھے ایک گھنٹے کے بعد۔ کھانا کھانے میں بھی کسر نفسی صاف جھلکتی تھی۔ کھانے کی سنتوں کا اہتمام کرتے تھے۔ کھانے کے بعد کچھ میٹھا ہو تو اس کے لیے الگ سے پیالے اور چمچ کا استعمال کرنے کے بجائے رکابی ہی میں نکال لیا کرتے تھے، اور ہاتھوں سے کھا لیتے تھے۔ کھانے کے بعد انگلیوں سے رکابی کو اچھی طرح صاف کر دیتے۔ جن چیزوں سے پرہیز کرنا ہوتا ان سے جم کر پرہیز کرتے تھے لیکن میں نے کبھی انھیں دسترخوان پر موجود کسی چیز میں نقص نکالتے یا منھ بناتے نہیں دیکھا۔ مجھے دادا کا یہ صحت والا فلسفہ بالکل نہیں بھاتا تھا، میرے نزدیک کھانے کی بس ایک ہی خصوصیت ہونی چاہیے اور وہ یہ کہ وہ لذیذ ہو۔ لیکن دادا زبان کے چٹخارے کے اسیر نہ تھے۔ وہ تو تیل سے پرہیز کرتے ہوئے مدتوں تک ابلا ہوا گوشت اور پانی میں بنایا گیا انڈا شوق سے کھاتے رہے۔ پرہیز اور پرہیزگاری کے اعلیٰ درجات کا ایسا حسین مرقع کہیں اور دیکھنا نصیب نہیں ہوا۔

.....

میں اور میری انگلیاں اب تھک چکی ہیں، مگر داستانِ شوق ابھی ناتمام ہے۔ لذتِ ذکرِ دوست میں اشہب قلم نہ جانے کن کن وادیوں میں بھٹکا ہے،

آرزو حسرت اور امید شکایت آنسو
اک ترا ذکر تھا اور بیچ میں کیا کیا نکلا

مگر امید ہے کہ شاید اس طولانی تذکرے میں تحریک اسلامی کے نئے قافلوں کو پرانے حدی خوانوں کی دل گداز نواؤں اور پاکباز اداؤں کا ایک عکس نظر آجائے۔ اگر کسی ادنی درجے میں بھی ایسا ہوسکا ہے تو یہ میرے لیے سعادت کی بات ہوگی۔

رہی بات دادا کی تو یہ قلمی تصویر فی الحال نامکمل ہی رہے گی، کیونکہ مصور کا قلم عاجز ہے، اور کیوں نہ ہو۔ سب سے بڑا چیلنج یہی ہے کہ تصویر کس کس زاویے سے بنائی جائے؟ علم کی ایسی قدر، مطالعے کا ایسا بلند ذوق، تربیت کا ایسا حکیمانہ انداز، تعلیم وتعلم کے لیے ایسی بے مثال جدوجہد، تحریک کے لیے ایسی جانثاری، عزائم کی ایسی بلندی، رویے میں ایسی انکساری، ہمعصروں سے ایسی محبت، نئی نسل کی ایسی فکر، اصولوں پر ایسی سختی، انداز میں ایسی شیرینی، معاملات میں ایسا کھرا پن، جذبات پر ایسا قابو، طرز زندگی میں ایسی سادگی، راہ خدا میں ایسی سخاوت، بیت المال کے تئیں ایسی احتیاط، شہرت وناموری سے ایسی بے نیازی... گلشنِ اطفال کا ایسا مالی — آہ! اُن کی ہر اک ادا بے نظیر تھی۔ دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ کسی ٹکسال سے اقبالؔ کے مردِ مومن کو ڈھال کر وجود بخشا گیا ہے، جس کی فقید المثال زندگی سے عظمتِ کردار کے موتی چنیں تو ہم اپنی خودی میں چار چاند لگا سکتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ دادا کی مغفرت فرمائے؛ ان کی بے پایاں اور ہمہ جہت خدمات کو شرف قبولیت بخشے؛ اور ان کی طرح ہمیں بھی رضائے الٰہی کی طلب میں اسلامی کاز کے لیے ہمہ تن وقف ہوجانے کی توفیق نصیب فرمائے۔ (آمین!)

ڈاکٹر خلیل احمد: شہر میں اک چراغ تھا نہ رہا

ڈاکٹر عمر خلیق

۲۸ اور ۲۹ رمئی کی درمیانی شب بذریعہ ایس ایم ایس یہ اطلاع موصول ہوئی کہ دادا کی طبیعت نہایت ناساز ہے۔ اطلاع کے موصول ہوتے ہی جہاں چھٹی حس ایک غمناک سانحے کو برداشت کرنے کی ذہن سازی میں جٹ گئی وہیں دل اس حس پر لعنت وملامت کرتے ہوئے خیالات کے رد میں مختلف جواز پیدا کرنے لگا۔ غرض کچھ دیر بعد غالباً ایک بجے شب والد محترم خلیق الرحمٰن صاحب نے اپنی بھرائی ہوئی آواز کے ذریعے یہ اطلاع دی کہ بیٹا، ابا اب ہمارے درمیان نہیں رہے۔ میں اس وقت تعزیت میں ایک بھی جملہ نہ کہہ سکا۔ شاید ذہن ابھی اس سانحے کے لیے تیار نہ تھا اور اگر ہوتا بھی تو ایسے موقع پر اپنے والد محترم سے جنھوں نے سایہ شفقت ومحبت کی شکل میں باپ جیسی کائنات کو ابھی ابھی کھویا ہو، میں ایک بھی تعزیتی جملہ کہنے سے قاصر تھا۔

بعض غم اتنے شدید ہوتے ہیں کہ دنیا کی مختلف زبانوں کے خوبصورت الفاظ مل کر بھی اس غم کی شدت کو کم نہیں کر سکتے۔ انتقال کی خبر جنگل کی آگ کی طرح راتوں رات پھیل گئی۔ ممبئی میں مقیم بڑے بیٹے (عتیق الرحمٰن)، بڑی بیٹی (درخشاں) اور حیدرآباد و دہلی میں مقیم پوتے اور پوتیوں کی آمد کی وجہ سے نماز جنازہ وتدفین بتاریخ ۲۹ مئی بعد نماز عصر طے پائی اور متعین وقت پر مسجد بلال کے دائیں جانب ان کے پوتے فہد خلیق فلاحی کی امامت میں نماز جنازہ کی ادائیگی کے بعد کرمہا کی باغ میں کنویں سے پورب کی سمت چار میٹر کے فاصلے پر ہزاروں سوگواروں کی موجودگی میں انھیں سپرد خاک کر دیا گیا۔

ڈاکٹر خلیل احمد صاحب کی تاریخ ولادت گرچہ دستاویزوں میں یکم نومبر ۱۹۳۳ء درج ہے لیکن بقول ان کے ان کی پیدائش ۱۹۳۱ء میں بلریا گنج کے ایک معزز خاندان میں ہوئی۔ ان کے آبا واجداد دس پشتوں سے یہیں آباد تھے۔ ان کے بڑے ابا (عبدالسلام) اور والد محترم (عبدالحمید) بالترتیب

بڑے قاضی اور چھوٹے قاضی کے لقب سے مشہور تھے۔اسی مناسبت سے بلریا گنج واطراف میں یہ گھرانہ آج بھی قاضی خاندان کے نام سے مشہور ومعروف ہے۔ مذکورہ قاضیین بچپن سے یتیم تھے،ان کے والد محترم (عبداللہ خاں) کے انتقال کے بعد دونوں کی کفالت و پرورش کی ذمہ داری ان کے لاولد چچا (شکراللہ خاں) نے نہایت خوش اسلوبی سے ادا کی اوران کی شفقت ومحبت تادم مرگ قاضیین پر قائم رہی۔ اسی کفالت اور مثالی سرپرستی کے نتیجے میں ڈاکٹر خلیل احمد صاحب جب اپنے دادا (شکراللہ خاں) کے احسانات کا ذکر کرتے تو ان کی آنکھیں نم ہوجاتیں۔ان کے اوصاف اور نیک نیتی کے اتنے واقعات میں نے دادا کی زبان سے سنے ہیں کہ خود ذاتی طور پر اپنے آباواجداد میں ان سے بے پناہ عقیدت ہے۔اس ضمن میں دادا ایک واقعے کا ذکر ہمیشہ کرتے کہ جب بھیّا (یعنی دادا کے والد محترم عبدالحمید خاں صاحب جنھیں دادا بھیّا کہہ کر پکارتے تھے) کی شادی طے پائی تو اس زمانے میں وراثت کوغصب کرنے کی روایت عام تھی اور چچا بھتیجے کے رشتے کا شمار تلخ رشتوں میں ہوتا تھا۔ چنانچہ ان کی سسرال کی جانب سے کسی شخص کو یہ خدشہ لاحق ہوا کہ یتیم عبدالحمید خاں کی پوری ملکیت ان کے چچا شکراللہ خاں کے قبضے میں ہے اور خدانخواستہ اگر انھوں نے اپنے بھتیجے کو وراثت سے محروم رکھا تو پھر یہ رشتہ معیار کے مطابق نہ ہوگا۔مشفق ومحترم شکراللہ خاں کے لیے یہ جملہ قیامت سے کم نہ تھا،انھوں نے فوری طور پر اپنے مرحوم بھائی عبداللہ خاں اور خود اپنی کل جائیداد اپنے دونوں بھتیجوں میں تقسیم کردی اور تادم مرگ اسی شفقت ومحبت سے سرپرستی فرماتے رہے۔

ڈاکٹر خلیل احمد صاحب کی ابتدائی تعلیم مقامی مکتب جامعہ اسلامیہ کے علاوہ بلریا گنج بازار خاص میں واقع گورنمنٹ سکنڈری اسکول سے ہوئی۔مکتب جامعہ اسلامیہ سے درجہ چہارم کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ۱۹۳۴ء میں ان کا داخلہ گورنمنٹ سکنڈری اسکول میں ہوا جہاں انھوں نے درجہ ہفتم تک تعلیم حاصل کی۔اس زمانے میں سکنڈری کی تعلیم درجہ پنجم، ششم اور ہفتم پر محیط تھی جو بعد میں ششم، ہفتم اور ہشتم ہوگئی۔آزادی سے ایک سال قبل ۱۹۴۶ء میں انھوں نے مشنری اسکول وسلی انٹر کالج اعظم گڑھ کا رخ کیا جہاں سے انھوں نے دسویں اور بارہویں کی تعلیم مکمل کی۔وسلی انٹر کالج، اعظم گڑھ میں ان کی ملاقات ایک آسٹریلیائی استاذ سے ہوئی، جن کے انگریزی زبان پر مکمل عبور ودسترس سے وہ بہت متاثر ہوئے اور وہیں سے انھیں انگریزی زبان وادب سے ایک خاص رغبت پیدا ہوئی جو تاحیات قائم رہی۔

اسی رغبت کی بناء پر انگزیری زبان کے مختلف جریدے اور کتابیں بالخصوص ریڈینس ویوز ویکلی عمر کے آخری مرحلے میں بھی ایک مخلص دوست کی طرح دست و بازو سے چسپاں اور ان کے تخت خواب کی زینت بنے رہے۔ جماعت اسلامی کی سرپرستی میں شائع ہونے والے مختلف روزنامے اور رسالے بالخصوص دعوت، کانتی اور دوسرے اردو اخبارات ہمیشہ ان کے مطالعے میں رہے۔ان اخباروں کے اشتہارات میں بھی وہ تبلیغ کے مختلف پہلوؤں کو تلاش لیتے۔اس ضمن میں غالباً اٹھارہ سال قبل بھدوہی شہر میں تعلیم نسواں کے فروغ کے لیے ایک مدرسے کے قیام کے سلسلے میں ایک اشتہار ان کی نظروں سے گزرا، چنانچہ انھوں نے اپنی پوتی ڈاکٹر آمنہ نسرین فلاحی بنت خلیق الرحمٰن سے یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ وہاں درس و تدریس کی خدمات انجام دیں۔ان کی خواہش کے پیش نظر ڈاکٹر آمنہ نسرین فلاحی نے بھدوہی کا رخ کیا، جہاں مولانا عبدالاحد فلاحی صاحب نے ان کی تدریسی لیاقت کا جائزہ لینے کے بعد منتظمین کے اغراض و مقاصد کے ضمن میں وضاحت کی کہ انتظامیہ جامعۃ الفلاح کی طرز پر تعلیم نسواں کے فروغ کے لیے ایک مدرسے کا قیام عمل میں لانا چاہتی ہے۔پھر منتظمین نے نہایت خوش اسلوبی سے فلاح المومنات عربک کالج نامی مدرسے کی بنیاد ڈالی اور باضابطہ تعلیم کا آغاز ہوا۔طالبات کی تعداد میں اضافہ ہوا تو دوسری پوتی محسنہ نسرین فلاحی بنت خلیق الرحمٰن بھی تدریسی خدمات پر مامور ہوئیں۔منتظمین ومعلمات کی باہمی ہم آہنگی اور ڈاکٹر آمنہ نسرین فلاحی کی بحیثیت پرنسپل اٹھارہ سالوں کی جہد مسلسل کے نتیجے میں اب اس مدرسے کو نہ صرف اصلاح معاشرہ کی مرکزی حیثیت حاصل ہے بلکہ یہ مدرسہ سیکڑوں تشنہ لبوں کی علمی، دینی اور ادبی تشنگی کو دور بھی کر رہا ہے۔چونکہ اس مدرسے کے قیام میں ڈاکٹر آمنہ نسرین فلاحی نے اپنا کلیدی کردار ڈاکٹر خلیل احمد کی ایماء پر ادا کیا تھا چنانچہ ''**اذا مات الانسان انقطع عنه عمله الا من ثلاث: الا من صدقة جارية او علم ينتفع به او ولد صالح يدعوله**'' کی روشنی میں ان شاءاللہ صبح قیامت تک انھیں اس کا اجر پہنچتا رہے گا۔

ڈاکٹر خلیل احمد صاحب کی پرورش نہایت ناز و نعم میں ہوئی۔ وہ عبدالحمید خاں کے اکلوتے وارث تھے چنانچہ ابا اور بڑے ابا کے علاوہ تینوں چچازاد بڑے بھائیوں (عبدالرشید، عبدالحفیظ اور ماسٹر فرید) نے بھی ہمیشہ انھیں دل و جان سے عزیز رکھا۔اس ضمن میں راقم الحروف نے بارہا مرحوم عبدالحفیظ خاں کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ ''خلیل ہم سب سے چھوٹا تھا چنانچہ وہ ہم تینوں بھائیوں کے علاوہ خاندان

کے تمام افراد کو بہت عزیز تھا۔ اس زمانے میں خاندانوں کی عزت وعظمت کا دارومدار زراعت وکاشت کاری پر تھا، چنانچہ میں (حفیظ خاں) اور چھوٹے بھیا (عبدالحمید خاں) اس کام کو پوری ذمہ داری سے سنبھالتے تھے جبکہ بقیہ دوسرے کاموں کی ذمہ داری فرید اور رشید کی تھی۔ خلیل کو شروع سے حصول تعلیم میں دلچسپی تھی اور وہ نہایت عزیز بھی تھا اسی وجہ سے ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ زراعت وکاشت کاری کی غرض سے کبھی بھی اسے کھیت وکھلیان میں قدم رکھنے کا موقع نہ ملے۔''

وہ لاڈ و پیار کے ضمن میں اس بات کا ذکر ضرور کرتے کہ یہاں سے تعلیم مکمل کرنے کے بعد جب خلیل نے وسلی میں داخلہ لیا تو آمد ورفت میں درپیش پریشانیوں کی وجہ سے اس کا قیام اعظم گڑھ ہو گیا۔ جب وہ ہفتے میں گھر آتا تو اس کے لیے کنویں کے پانی میں رسی کے ذریعے گنّے ڈبو کر رکھے جاتے تاکہ وہ نرم اور خوش مزہ ہوں۔

۱۹۴۹ء میں ڈاکٹر خلیل احمد عظمت النساء کے ہمراہ رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئے۔ عظمت النساء کا تعلق شاہ پور نوادہ کے ایک زمیندار خاندان سے تھا۔ وہ مسعود خاں کی صاحبزادی، کامل خان کی بھتیجی اور محفوظ الرحمٰن ہمدم شاہ پوری کی بھانجی تھیں۔ حسن سیرت اور نفاست میں اپنی مثال آپ تھیں۔ زوجۂ عزیز کی امور خانہ داری میں مہارت کے سبب ہی ڈاکٹر خلیل احمد کو فرصت کے وہ تمام لمحے میسر تھے جو فروغ جامعۃ الفلاح اور تحریک جماعت اسلامی کے لیے صرف ہوتے تھے۔

شادی کے چند سالوں کے بعد موصوف نے اعلیٰ تعلیم کی غرض سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا رخ کیا، جہاں طبیہ کالج سے انھوں نے بی۔ یو۔ ایم۔ ایس کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۵۶ء میں حصول تعلیم کے بعد جب وطن واپسی ہوئی تو اولا انھوں نے علاج معالجہ کے لیے گھوسی بازار کا انتخاب کیا۔ معالجین کی کمی اور خداداد دستِ شفا کی وجہ سے ایک مختصر سی مدت میں وہ گھوسی اور اس کے قرب وجوار کے لوگوں کی ضرورت بن گئے۔ اسی دوران بلریا گنج میں ان کے والد محترم عبدالحمید خاں کو یہ فکر ستائے جارہی تھی کہ ان کی اکلوتی اولاد ان کی نظروں سے دور ہے۔ چنانچہ متعدد دفعہ انھوں نے اپنے بیٹے تک یہ پیغام پہنچایا کہ وہ گھوسی بازار چھوڑ کر بلریا گنج کو علاج ومعالجہ کا مرکز بنائے۔ لیکن بیٹے کے لیے باشندگان گھوسی کا خلوص ومحبت زنجیر پا بنی ہوئی تھی۔ بالآخر والد محترم عبدالحمید خاں ایک سخت فیصلے پر مجبور ہوئے اور انھوں نے مرحوم شیخ حنیف صاحب (میڈیا سیٹی) کو ان کی بیل گاڑی کے ہمراہ اس حکم کے

ساتھ روانہ کیا کہ وہ بلا جھجھک ان کے بیٹے کو مع کل ساز وسامان بلریا گنج پہنچا دیں۔ مرحوم شیخ حنیف صاحب ان کے حکم پر عمل پیرا ہوئے اور ڈاکٹر خلیل احمد مع کل ساز وسامان جس میں میز، کرسی، مختلف ادویات وآلات کے علاوہ روزمرہ کی ضروریات کے سامان بھی شامل تھے، اپنے آبائی وطن بلریا گنج تشریف لے آئے۔

بلریا گنج واپسی کے بعد انھوں نے بازار خاص کی جامعہ مسجد کے اتر جانب تقریباً ۵۰ میٹر کے فاصلے پر پورب کی سمت (مرحوم محمد طاہر صاحب جو عرف عام میں طاہر گھڑی والے کے نام سے مشہور ہیں، کے کٹرے کے سامنے) طبی مشق کی شروعات کی۔ چند سالوں کے بعد ان کے اپنے مطب کا قیام عمل میں آیا جہاں انھوں نے تقریباً تیس سال تک ایک مشہور معالج بالخصوص ماہر امراض اطفال کی حیثیت سے اپنی خدمات انجام دیں۔ چونکہ ان کو حصول تعلیم اور فروغ تعلیم سے خاص دلچسپی تھی اس لیے انھوں نے مطب کے پچھلے حصے میں چند اضافی کمروں کی تعمیر اس غرض سے کرائی تاکہ بچوں کی تعلیم وتربیت کا انتظام ان کی نظروں کے سامنے ہو سکے۔ ان کے دونوں بڑے صاحب زادے عتیق الرحمٰن اور خلیق الرحمٰن، بھتیجے حسیب عالم، ماسٹر شاہنواز صاحب اور مرحوم ظفر الاسلام (نھو) صاحب کی تعلیم وتربیت کی سیکڑوں خوشنما یادیں ان کمروں سے وابستہ ہیں۔

دورانِ علاج ومعالجہ ڈاکٹر خلیل صاحب کی شہرت ومقبولیت مسلم معاشرے کے علاوہ بلریا گنج سے مغرب اور اتر کی جانب واقع ہندو اکثریتی گاؤں میں زیادہ تھی۔ ان کے مریضوں کی اکثریت میں غیر مسلم تھے جنھیں نہ صرف موصوف کے دست شفاء پر مکمل یقین تھا، بلکہ وہ ان کے حسن سلوک سے حد درجہ متأثر بھی تھے۔ یہی وجہ تھی کہ بعض غیر مسلم خاندانوں سے گھریلو تعلقات قائم ہوئے جو آخری وقت تک برقرار رہے۔ جنازے پر دست بستہ اور نم دیدہ کھڑے غیر مسلموں کی تعداد موصوف کے حسن سلوک کی نہ صرف قوی دلیل تھی بلکہ ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب اور اخوت ومحبت کی اعلیٰ مثال بھی تھی۔ تعزیت کے دوران بعض غیر مسلم خاندانوں کے وارثین نے اپنے اور اپنے بزرگوں پر موصوف کے ذریعے کیے گئے احسانات کا ذکر جس سوز دروں سے کیا وہ یقیناً قابل ستائش ہے لیکن چونکہ موصوف نے اپنی زندگی میں ان تمام واقعات کو در پردہ رکھا اس وجہ سے یہاں اس کا ذکر نا مناسب ہوگا۔

بیسویں صدی کے اواسط میں بلریا گنج کے جن معززین نے مکتب جامعہ اسلامیہ کو ایک عالمی

ادارہ بنانے کا خواب سجایا ان میں ڈاکٹر خلیل احمد کا نام سرفہرست ہے۔ ۱۹۵۸ء سے ۲۰۲۳ء (کل ۶۵ سال) وہ جامعۃ الفلاح سے وابستہ رہے۔ ۱۹۶۳ء میں ۳۲ سال کی عمر میں پہلی دفعہ نظامت کے مرتبے پر فائز ہوئے۔ ۱۹۶۹ء میں جب انھوں نے حج بیت اللہ کا ارادہ کیا تو نظامت کی ذمہ داری سے سبکدوش ہوئے۔ حج بیت اللہ سے واپسی کے بعد دو مختلف میقات کے لیے ناظم مقرر کیے گئے۔ نظامت کے علاوہ وہ نائب ناظم اور مہتمم تعلیم و تربیت کے عہدے پر بھی مامور رہے۔ مسجد جامعہ، شعبہ نسواں اور مرکزی لائبریری کا قیام ان کے دور نظامت کی سنہری یادیں ہیں۔ چونکہ جامعۃ الفلاح کے قیام و ترقی میں ڈاکٹر خلیل احمد کے کلیدی کردار پر بیشتر مقالہ نگار مفصل روشنی ڈالیں گے، اس لیے میں اس سے صرف نظر صرف ایک واقعے کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں، جس سے ذمہ داران فلاح بشمول ڈاکٹر خلیل احمد سخت آزمائش سے دوچار ہوئے۔ ۹۲-۱۹۹۱ء میں نظام آباد کے اطراف میں کسی گاؤں سے ایک ہندو خاندان کے کل افراد مشرف بہ اسلام ہوئے لیکن جلد ہی ماں نے توفیق ہدایت کا انکار کیا اور وہ اپنے اصل دین کی طرف واپس لوٹ گئی۔ دینی تعلیم کے حصول کی غرض سے اس خاندان کے دو افراد (بھائی اور بہن) نے جامعۃ الفلاح کا رخ کیا۔ ماں کو جب اس بات کا علم ہوا تو اس نے بریڑیا کے چند افراد کے علاوہ جامعۃ الفلاح کے تمام ذمہ داروں کے خلاف مقدمہ درج کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس معاملے نے سیاسی رنگ اختیار کرلیا۔ جامعۃ الفلاح کے تمام ذمہ داروں بشمول ڈاکٹر خلیل احمد کا اریسٹ وارنٹ جاری ہوا۔ موصوف ان دنوں اختلاج کے مرض میں مبتلا تھے اور علاج کی غرض سے دہلی میں مقیم تھے۔ دہلی سے واپسی ہوئی تو حالات کے پیش نظر مئو شہر میں ڈاکٹر ضیاء الاسلام عثمانی کے یہاں ہفتوں روپوش رہے۔ حالات قدرے موافق ہوئے تو اعظم گڑھ اس غرض سے واپسی ہوئی کہ خود ان کو اور ان کے اہل وعیال کو اطمینان حاصل ہو سکے اور عدالتی کاموں میں بھی تیزی لائی جا سکے۔ اعظم گڑھ واپسی کے بعد سدھاری، اعظم گڑھ میں وہ ماسٹر عبداللہ صاحب کے بہنوئی جبکہ بلریا گنج میں وہ جھینا آپا (مرحوم ڈاکٹر داؤد صاحب) کے گھر روپوش رہے۔ ایک روز ان کی اہلیہ عظمت النساء حد درجہ بضد ہوئیں تو رات کی تاریکی میں ملاقات کی غرض سے گھر بھی تشریف لائے۔ روپوشی کے دوران جامعۃ الفلاح، نسواں اور مختلف مقامات کے علاوہ موصوف کے گھر پر چھاپہ ماری ہوئی۔ متعدد چھاپوں کے بعد جب ملزمین بشمول ڈاکٹر خلیل صاحب کا کوئی سراغ نہ لگ سکا تو قرق ضبطی کی کارروائی کا حکم ہوا۔ مرحوم ممتاز خاں

بن مجید خان کی سرپرستی میں محلے پڑوس کے تمام لوگوں نے اخوت ومحبت کی بےنظیر مثال قائم کی اور ڈاکٹر خلیل صاحب کے گھر کا سارا ساز وسامان اپنے اپنے گھروں میں اس غرض سے چھپالیا کہ قرق ضبطی کی کارروائی کے دوران انھیں نقصانات سے بچایا جاسکے۔ ضلعی عدالت سے ضمانت رد ہونے کی وجہ سے ڈاکٹر خلیل احمد خود بخود حاضر ہونے پر مجبور ہوئے اور قید و بند کی چند روزہ صعوبتوں کے بعد ہائی کورٹ سے ضمانت منظور ہونے پر انھیں رہائی حاصل ہوئی۔ اس مشکل مرحلے میں جن محسنین نے دست محبت دراز کیا ان میں ڈاکٹر ضیاء الاسلام عثمانی صاحب (مئو)، ملتان وکیل صاحب (رسول پور)، ماسٹر جلیل صاحب (رسول پور)، ماسٹر عبداللہ صاحب (سمبھی)، احسان وکیل صاحب (شیخو پور)، محفوظ پردھان صاحب (نصیر پور)، نبی سرور خاں صاحب (بلریا گنج)، جھینا آپا (بلریا گنج) اور ممتاز خاں صاحب (بلریا گنج) کے نام قابل ذکر ہیں۔ اس واقعے کے بعد جامعۃ الفلاح ہندوستان کی خفیہ ایجنسیوں بالخصوص سی۔آئی۔ڈی۔ کی مشکوک نظروں کا شکار ہوا اور مختلف معاملات میں ڈاکٹر خلیل احمد صاحب بارہا تفتیش کی غرض سے طلب کیے گئے۔ تفتیش کا یہ سلسلہ جب جامعۃ الفلاح کے نظم ونسق کو برقرار رکھنے میں دشواریوں کا سبب بنا تو موصوف نے چاروناچار اس کا ذکر اپنے عزیز محترم راج کمار رائے صاحب (سابق ایم۔پی، جنتادل) سے کیا۔ انھوں نے اس سرگردانی سے مکمل نجات کی یقین دہانی کرائی اور چند روز بعد موصوف کو شہر بنارس میں منعقد ایک شادی کی تقریب میں مدعو کیا جہاں ڈاکٹر خلیل صاحب کی ملاقات خفیہ ایجنسی کے کسی اعلی افسر سے کرائی گئی۔ ملاقات کے دوران جامعۃ الفلاح سے متعلق خفیہ ایجنسیوں کی تمام بدگمانیاں دور کی گئیں جس کے نتیجے میں جامعۃ الفلاح کے ساتھ ساتھ اس کے تمام منتظمین کو بھی اس سرگردانی سے نجات حاصل ہوئی۔

ڈاکٹر خلیل صاحب ایک طویل مدت تک شبلی نیشنل پی جی کالج کی انتظامیہ کا حصہ رہے۔ وہ تاحیات رکن کے علاوہ بارہا مجلس عاملہ کے لیے منتخب ہوئے۔ جامعۃ الفلاح کے ساتھ ساتھ شبلی نیشنل کالج سے وابستگی ان کی ترقی پسند طبیعت کا آئینہ دار ہے جو روایت و جدیدیت کے سنگم کا سرچشمہ تھی۔ ان کی دیرینہ خواہش تھی کہ سرزمین اعظم گڑھ کو جہاں مدارس میں جو مرکزی حیثیت حاصل ہے وہی حیثیت جدید علوم وفنون میں بھی حاصل ہو، چنانچہ اس ضمن میں وہ ستر اور اسّی کی دہائی میں ایک ٹیکنیکل کالج اور ایک طبیہ کالج کی بنیاد کے لیے کوشاں ہوئے۔ مرحوم مولوی مسعود صاحب منگراواں

(سابق ایم ایل اے) اور دوسرے مخلصین و رفقاء کی مشاورت سے ٹیکنیکل کالج کے قیام کے لیے گلواں گوری جبکہ طبیہ کالج کے لیے لچھی رام پور کی نشاندہی کی گئی۔ قبل اس کے کہ کیمپس کا وجود عمل میں آتا باضابطہ بی۔ یو۔ ایم۔ ایس کا آغاز کیا گیا۔ کرول باغ، دہلی سے ڈاکٹر اشتیاق صاحب مرحوم اور ان کی اہلیہ ڈاکٹر نزہت اشتیاق نے تدریسی خدمات کے لیے بلریا گنج کا رخ کیا اور ڈاکٹر خلیل صاحب کے مطب کے اوپری منزل پر قیام پذیر ہوئے۔ کوئی مستقل کیمپس نہ ہونے کی وجہ سے جامعۃ الرشاد میں بی۔ یو۔ ایم۔ ایس۔ سال اول کی کلاسس کا آغاز ہوا، جہاں ڈاکٹر اشتیاق صاحب اور ڈاکٹر نزہت صاحبہ کے علاوہ ڈاکٹر خلیل صاحب نے بھی تدریسی خدمات انجام دیں لیکن بعض وجوہات کی بنا پر طبیہ کالج اور ٹیکنیکل کالج کے قیام کا یہ منصوبہ عمل میں نہ آسکا اور ایک سال مکمل ہونے کے بعد طلبہ و طالبات کو دوسرے طبیہ کالج میں منتقل کر دیا گیا۔

ڈاکٹر خلیل صاحب طبیہ کالج بینا پارہ سے بھی منسلک رہے۔ کالج کے قیام کے ابتدائی ایام میں موصوف نے وہاں تدریسی خدمات انجام دیں۔ حصول تعلیم سے دلچسپی اور فروغ تعلیم کے مخلصانہ جذبے کے پیش نظر انتظامیہ نے اس بات کی خواہش ظاہر کی کہ موصوف طبیہ کالج کی تاحیات ممبرشپ قبول فرمائیں۔ جبکہ انتظامیہ کے دستور میں جغرافیائی قید و بند درج تھی اور چند مخصوص گاؤں کے علاوہ کسی دوسرے گاؤں کے افراد کالج کی ممبرشپ کے اہل نہ تھے۔ اس بندش کے باوجود ایک خصوصی رعایت کے تحت موصوف کو ممبرشپ کی پیش کش کی گئی لیکن موصوف نے دستور کا پاس ولحاظ رکھتے ہوئے اس پیش کش کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

ڈاکٹر خلیل احمد صاحب کا ایک اور گراں قدر کارنامہ جامعۃ الفلاح کا ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں سے الحاق ہے۔ ان کی دور اندیش نظروں نے قبل از وقت اس ضرورت کو محسوس کیا کہ فارغین جامعہ کی اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے اسناد جامعہ کی قبولیت لازم ہے۔ اس ضمن میں جب اطہر ریحان فلاحی صاحب نے اسناد جامعہ کی بنیاد پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخلے کی کوشش کی تو یہ بات منظر عام پر آئی کہ ہندوستان کی کسی بھی یونیورسٹی میں اسناد جامعہ کو قبولیت کا درجہ حاصل نہیں ہے۔ موصوف کو یہ خبر موصول ہوئی تو فوری طور پر مجلس عاملہ کے ہنگامی اجلاس کا انعقاد ہوا، جس میں متفقہ طور پر یہ فیصلہ لیا گیا کہ بلا تاخیر الحاق کی کوششوں کا آغاز ہو۔ حسب منصوبہ دستاویزات کی تیاری مکمل ہوئی

اور فلاح سے دورکنی وفد بشمول مولانا مطیع اللہ فلاحی صاحب اور نگراں جنید صاحب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے لیے روانہ ہوئے، جہاں یہ ضروری دستاویزات اطہر ریحان غوری صاحب اور حمداللہ فراہی صاحب کے سپرد کر دیے گئے۔ ڈاکٹر خلیل احمد کے صاحبزادے خلیق الرحمٰن جو خود اسی دوران علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھے، اس واقعے کو ان لفظوں میں بیان فرماتے ہیں: ''زیڈ کے فیضان صاحب سے میرے اچھے مراسم تھے۔ وہ ان دنوں اسٹوڈنٹ یونین کے پریسیڈینٹ تھے۔ ایک روز کسی طالب علم کے داخلے کی غرض سے میں ان کے اتاق پر تشریف لے گیا۔ یکا یک میری نظر ایک دستاویز پر پڑی جو ان کی میز پر رکھا ہوا تھا، جس میں روداد جامعۃ الفلاح کے علاوہ نصاب کی تفصیلات بھی درج تھیں۔ میں نے تفریحاً خان صاحب (زیڈ کے فیضان) سے عرض کیا کہ کیا یہ دستاویز کسی قسم کے مالی تعاون کے سلسلے میں ہے؟ انھوں نے جواباً عرض کیا کہ اگر مالی تعاون کے سلسلے میں ہوتا تو کوئی خاص دشواری نہ تھی بلکہ دو لوگ کئی روز سے مذکورہ ادارے کی مدد کی غرض سے تشریف لا رہے ہیں لیکن انھیں مالی امداد کے بجائے کسی دوسری مدد کی ضرورت ہے جو میری سمجھ سے پرے ہے۔ میں (خلیق الرحمٰن) نے اس ادارے کی تفصیل اور اس کے تئیں ابا (ڈاکٹر خلیل احمد) کی کوششوں کا ذکر کیا جس کے نتیجے میں خاں صاحب کی دلچسپی میں اضافہ ہوا اور انھوں نے اطہر ریحان غوری اور حمداللہ فراہی کو بلا بھیجا تا کہ ان سے مزید معلومات کے بعد الحاق کی کوشش شروع کی جا سکے۔ دوسرے دن سرِشام ہم تینوں خاں صاحب کے ہمراہ رجسٹرار صاحب کی قیام گاہ تصویر محل پہنچے جہاں الحاق کی تجویز پیش کی گئی۔ ایس ایس ہال میں واقع رجسٹرار آفس میں مختلف ملاقاتوں کے بعد یہ بات واضح ہوئی کہ یونیورسٹی کے تمام شعبوں کی قبولیت و رضامندی کے بعد ہی الحاق ممکن ہے۔ اطہر ریحان غوری اور زیڈ کے فیضان صاحب کی مسلسل کوششوں کے نتیجے میں تمام شعبوں سے جامعۃ الفلاح کے معیار و نصاب کو قبولیت کا درجہ حاصل ہوا اور اکیڈمک کونسل سے یہ تجویز پاس ہوئی۔ بعض شعبوں کی نشاندہی پر جامعۃ الفلاح کے نصاب میں قدرے ترمیم بھی ہوئی۔ اس کام کو مکمل ہونے میں تقریباً تین سال کا وقت صرف ہوا۔ ان تین سالوں میں اطہر ریحان غوری اور بالخصوص زیڈ کے فیضان صاحب کی ذاتی، سیاسی اور سماجی مصروفیات میں اضافہ ہوا لیکن ان کی مصروفیت ہرگز اس کام میں رکاوٹ نہ بنی، بلکہ ذاتی طور پر صرف اسی کام کی غرض سے وہ بارہا بیرون شہر سے علی گڑھ تشریف لائے اور اپنے ذاتی تمایل و رغبت کی بنیاد پر اس کام کو بخوبی

پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ ان کی اس بے لوث خدمت کے لیے فارغین جامعہ ہمیشہ ان کے ممنون ومشکور رہیں گے۔ اس الحاق کی بنیاد پر نہ صرف جامعۃ الفلاح کا الحاق ہندوستان کی دوسری یونیورسٹیوں سے ہوا بلکہ دوسرے مدارس بھی اسی بنیاد پر مختلف یونیورسٹیوں سے ملحق ومتصل ہوئے۔

جامعۃ الفلاح کی نظامت کی آخری میقات ۲۰۰۰ء میں مکمل کرنے کے بعد ڈاکٹر خلیل صاحب کی توجہ مزید توشۂ آخرت کی طرف مبذول ہوئی۔ جماعت اسلامی کے ذمہ داروں نے جب یتیم ونادار بچوں کی تعلیم وتربیت کی غرض سے بلریا گنج میں ایک یتیم خانے کے قیام کی تجویز پیش کی تو ڈاکٹر خلیل صاحب نے اپنے چچازاد بھائی عبدالحفیظ خان سے بلاواسطہ جبکہ عبدالرشید خان اور ماسٹر فرید خان کے وارثین کی باہمی مشاورت سے بازار خاص بلریا گنج سے پورب کی سمت ایک مشترکہ پشتینی زمین وقف کی، جہاں ان کی سرپرستی میں گلشن اطفال کا قیام عمل میں آیا جو فی الحال یتیم ونادار بچوں کا مسکن ہے۔ ابتدا میں یہ کیمپس صرف ایک مسجد پر محیط تھا جس کے اوپری حصے کو درس وتدریس کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ اب مسجد کے علاوہ ایک تین منزلہ عمارت بھی ہے جو بچوں کی تربیت گاہ اور مسکن ہے اور مسجد کا اوپری حصہ جو ابتداء میں درس وتدریس کے لیے مختص تھا وہ جماعت اسلامی کی مختلف نشستوں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

عبادت گاہوں کو آباد رکھنے کے مختلف مراحل اس کی تعمیرات سے کہیں زیادہ مشکل ودشوار ہوتے ہیں۔ جس زمانے میں گلشن اطفال کی مسجد کا قیام عمل میں آیا اس وقت وہ مقام آبادی سے قدرے فاصلے پر تھا۔ چناچہ خود ڈاکٹر خلیل صاحب نے مسجد کو آباد کرنے کی غرض سے سالہا فجر وعشاء کی نمازیں وہیں ادا کیں۔ حسب معمول گھر کے کسی فرد کو وہ اپنے ہمراہ نماز کے لیے لے جاتے۔ خود راقم حروف کو بارہا ان کے ہمراہ گلشن اطفال میں فجر کی نماز ادا کرنے کا موقع ملا جہاں بمشکل دو تین افراد ہوتے لیکن وقت کے ساتھ آبادی میں اضافہ ہوا اور اب وہاں نمازیوں کی کثرت ہے۔

گلشن اطفال کے مکمل طور پر آباد ہونے کے بعد ڈاکٹر خلیل صاحب نے مسجد بلال کی تعمیر وترقی کی ذمہ داری اپنے سر لی۔ یہ مسجد قصبہ کے مغرب جانب کورمہا کی باغ کے قریب واقع ہے۔ درون مسجد ایک کتب خانہ بھی موجود ہے جہاں طلبہ کی تعلیم وتربیت کی غرض سے بعض درسی اور بیش تر غیر درسی کتابیں دستیاب ہیں جو عبادت وریاضت کے بعد علمی تشنگی کو دور کرنے کے مواقع فراہم کرتی

ہیں۔موصوف نے اپنی زندگی کی آخری دہائی کے بیشتر ایام اسی مسجد میں گزارے۔وہ حسب معمول فجر کی نماز یہیں ادا کرتے اور پھر تلاوت وتدبر کے بعد ہی گھر لوٹتے۔ظہر سے قبل وہ دوبارہ مسجد کا رخ کرتے اور عصر تک ان کا قیام مسجد میں رہتا۔اس دوران وہ مسجد کی صفائی کا خاص خیال رکھتے۔وہاں موجود طلبہ سے علمی گفتگو فرماتے اور مسجد کے تمام گوشوں بالخصوص وہاں موجود کتب کا جائزہ لیتے۔ نفاست وخاکساری کا یہ عالم تھا کہ نوے برس کی عمر میں مسجد کے صحن میں خود جھاڑو لگاتے اور جب کوئی شخص احتراماً ان کے ہاتھوں سے جھاڑو لے لیتا تو عرض کرتے کہ میری عمر کا احترام لازم ہے لیکن مجھے بھی کار خیر کے مواقع میسر آنے چاہئیں۔

ڈاکٹر خلیل صاحب مزاجاً سخت تھے۔ابتدا میں ان کو زمینداری اور حسب ونسب کا زعم بھی تھا جو جماعت اسلامی سے وابستگی کے بعد رفتہ رفتہ جاتا رہا۔اپنے زعم کے دنوں کو یاد کرتے ہوئے وہ ایک واقعے کا ذکر یوں کرتے تھے کہ ''میں ایک روز اپنی سسرال شاہ پور میں مقیم تھا، وہاں کے ایک ہرواہے نے مجھ سے زمینوں اور گھر پر موجود کل جانوروں کی تفصیل جاننے کی خواہش ظاہر کی۔جب میں نے تفصیلات بتائیں تو اس نے عرض کیا کہ صاحب (یعنی سسرال کے لوگ) آپ سے بڑے زمیندار ہیں اور ان کے مویشیوں کی تعداد بھی آپ کے مویشیوں سے زیادہ ہے۔مجھے اس بات پر زعم طاری ہوگیا چنانچہ میں نے دوسرے دن بلریا گنج واپسی کے بعد فوراً سلطان شاہ کو جو زمینوں کی خرید وفروخت کا علم رکھتے تھے، پانچ سو روپے پیشگی ادا کیے تاکہ بلریا گنج واطراف میں کسی زمین کی خریداری کی جاسکے۔ مویشیوں کے حوالے سے میں نے بھیا (ابا) سے عرض کیا کہ ان کی تعداد میں اضافہ کیا جائے لیکن انھوں یہ کہہ کر بات ٹال دی کہ اگر مویشیوں کی کثرت ہوگی تو پوری فصل ان کا ہی چارہ بن کر رہ جائے گی۔''

عین جوانی میں موصوف کی فکر وطبیعت پر مغربی اثرات حاوی تھے، ان کا لباس مغربی طرز کا تھا، وہ پینٹ شرٹ میں ملبوس سر پر بڑی ہیٹ لگائے گھوڑے کی سواری کرتے تھے۔فلاح اور جماعت سے وابستگی کے بعد مغربی اثرات سے دوریاں بڑھتی گئیں اور رفتہ رفتہ وہ مشرقی تہذیب کے علمبردار ہوگئے۔پینٹ شرٹ کی جگہ شیروانی نے لے لی اور ہیٹ کے بجائے انھوں نے قراقری (کشتی نما مخملی) ٹوپی کا استعمال شروع کردیا۔وہ ایک بارعب شخصیت کے مالک تھے چنانچہ کسی بھی شخص کو پہلی دفعہ ان سے ہم کلام ہونے میں جھجک محسوس ہوتی تھی۔حتی کہ ان کی اپنی اولاد بھی ان سے براہ راست گفتگو سے

پرہیز کرتی تھی۔ البتہ پوتیاں، پوتے اور نواسے جو درحقیقت ان کے بارعب زمانے سے بے خبر تھے، وہ موصوف سے تمام موضوعات پر براہ راست اور بے تکلف گفتگو کرتے تھے۔ بسا اوقات پوتے، پوتیوں اور دادا کے درمیان بے تکلفی ان کی اپنی اولاد کو اس حیرت میں مبتلا کر دیتی کہ ایک بارعب شخص ان بچوں کے ہمراہ اتنی بے تکلفی کیسے اختیار کر سکتا ہے۔

موصوف کی شخصیت سراپا عملی اور اصولی تھی وہ کسی کام کے فوری نتیجے کے حق میں نہ تھے، ان کے مطابق کسی کوشش میں خلوص و دوام ہو تو اس کے اچھے نتیجے سالوں بعد سہی لیکن ضرور رونما ہوتے ہیں۔ وہ تنقید و اصلاح میں مصلحتاً خاموش رہنے کے قائل نہ تھے بلکہ کسی بھی قسم کی ضابطہ شکنی انھیں فوراً چراغ پا کر دیتی تھی۔ گھر، خاندان اور محلے کے طلبہ و طالبات کی تعلیمی سرگرمی سے باخبر رہنا ان کا مزاج تھا۔ تعلیمی ادارے اور تعلیم سے رغبت رکھنے والے افراد انھیں نہایت عزیز تھے۔ ایام امتحان میں مساجد میں پڑھتے بچوں کو دیکھ ان کو بے حد مسرت ہوتی تھی۔ ان کا حکم تھا کہ مسجد بلال کے اندرونی حصے کو ایام امتحان میں مقفل نہ کیا جائے تاکہ طلبہ اطمینان کے ساتھ مسجد میں میسر سہولیات سے مستفید ہو کر اپنی تیاری مکمل کر سکیں۔ حسب معمول جب وہ سرِصبح گھر کے تمام افراد کو بیدار کرتے تو بسا اوقات ان کی پوتیاں مطالعے میں مصروف ہوتیں۔ ان کو مطالعے میں محو دیکھ موصوف کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہتی اور وہ اپنی چائے ناشتہ غرض صبح صادق سے ناشتے کے درمیان میسر اپنی تمام غذائیں مطالعے میں محو پوتیوں کے حوالے کر دیتے۔ حسب عادت وہ فجر سے گھنٹوں قبل بیدار ہوتے۔ تہجد کی ادائیگی گھر پر کرنے کے بعد فجر کی نماز کے لیے مسجد کا رخ کرتے۔ تہجد و فجر کے درمیان چائے کے بجائے شہد کے شربت کو ترجیح دیتے، چونکہ شہد ان کی پسندیدہ غذا تھی چنانچہ صبح کے شربت کے علاوہ ناشتے میں بھی شہد کا پیالا ان کے دسترخوان پر ضرور ہوتا۔ دوران سفر شہد کی بوتلیں ان کے ہمراہ ہمیشہ ہوتیں۔ شہد کے علاوہ گوشت اور مچھلی ان کی پسندیدہ غذا تھی۔ وہ دن میں صرف ایک بار (۱۰ سے ۱ بجے کے درمیان) کھانے کے قائل تھے۔ رات کا کھانا مغرب و عشاء کے درمیان تناول فرماتے اور عشاء کے فوراً بعد سونا ان کا معمول تھا۔ انھوں نے ایک بامقصد اور خوشحال زندگی گزارنے کے بعد بانوے سال کی عمر میں اس دنیا کو خیرآباد کہا۔ اللہ ان کی کوششوں کو قبول فرمائے۔ ان کی اولاد کو ان کے لیے صدقہ جاریہ بنائے اور انھیں جنت میں اعلیٰ مقام عطا کرے۔

انھوں نے سوگواروں میں کل چار بیٹے اور تین بیٹیاں اپنے پیچھے چھوڑی ہیں۔ بیٹیاں (درخشاں، لبنیٰ اور عظمیٰ) بالترتیب ہنگائی پور، بندول اور برہڑیا میں بیاہی ہیں۔ بیٹوں میں بڑے صاحبزادے عتیق الرحمٰن ممبئی میں مقیم ہیں جبکہ بقیہ تینوں صاحبزادے وطن میں ہی قیام پذیر ہیں۔ ڈاکٹر انیس الرحمٰن اپنے والد محترم کی طبی خدمات کی روایت کو قائم کیے ہوئے ہیں جبکہ خلیق الرحمٰن اور عبیدالرحمٰن نسل آئندہ کی تعلیم وتربیت کی ذمہ داریوں کو بحسن وخوبی ادا کررہے ہیں۔ یوں تو موصوف کی مذکورہ تمام اولاد فرمانبردار اور خدمت گزار تھی لیکن ان کے چھوٹے صاحبزادے عبیدالرحمٰن نے ایک طویل مدت تک خدمت گزاری کا جو اعلیٰ نمونہ پیش کیا ہے وہ ہم سب کے لیے مشعل راہ ہے۔

آہ! وہ ہمیں چھوڑ گئے

خان طاہر

جامعۃ الفلاح کی مجلس شوریٰ کے رکن، گلشن اطفال اور مسجد بلال کے بانی، جامعۃ الفلاح کے تین بار رہ چکے ناظم، جماعت اسلامی ہند کے ایک اہم رکن، بلریا گنج کے پہلے گریجویٹ، شبلی نیشنل کالج کی مجلس شوریٰ کے رکن، جامعۃ الفلاح کو جامعہ ملیہ اسلامیہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، لکھنؤ یونیورسٹی اور ایسی بہت سی یونیورسٹیز سے منسلک کرانے والے جناب ڈاکٹر خلیل احمد ۲۸ اور ۲۹ رمئی کی درمیانی شب تقریباً ۱ر بجے اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

بچھڑا کچھ اس ادا سے کہ رُت ہی بدل گئی
اک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا

دادا کوہ نور جیسے کردار کے حامل تھے لیکن ان کی عظمت کا صحیح اندازہ مجھے ۳۰ رمئی کو جامعۃ الفلاح میں منعقد دادا کی تعزیتی نشست میں ہوا۔ پروگرام کے دوران دادا کی زندگی کے ان پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی جن سے متعلق چند لوگوں کے علاوہ کوئی نہیں جانتا ہوگا۔

پروگرام کے بعد میں یہ سوچ کر ابھی تک حیران ہوں کہ اتنی اعلی کردار شخصیت اتنی سادہ زندگی کیسے گزار سکتی ہے؟؟؟

ایسے دور میں جہاں زکوۃ دینے سے پہلے سیلفی، حج کرنے سے پہلے اسٹوری اور عمرہ کرنے سے پہلے واٹس ایپ اسٹیٹس لگا دیا جاتا ہے اس دور میں اتنے بڑے بڑے کارنامے انجام دینے کے بعد بھی ان پر تا حیات پردہ ڈالے رکھنا ایک متقی اور پرہیز گار انسان ہونے کی بہترین دلیل ہے۔

کچھ والدین اپنے بچوں کی اعلی تعلیم پر زیادہ توجہ نہیں دیتے لیکن یہ کہنا بالکل غلط نہیں ہوگا کہ اپنے ہر پوتے اور پوتی کی اعلی تعلیم میں دادا کا بھی یا دادا کا ہی ہاتھ ہے۔

مجھے آج بھی یاد ہے رزلٹ آنے کے بعد جب دادا میرا رینک پوچھتے تھے، میرے دوم یا سوم کہنے پر وہ ڈانٹتے، مارتے یا کسی قسم کے غصے کا اظہار نہیں کرتے تھے، بلکہ مذاق میں پوچھتے تھے کہ اول آنے والے کے پاس تین ہاتھ تھا؟ چار پیر تھا؟ چار آنکھیں تھیں؟ اگر نہیں تو تم اول کیوں نہیں آئے؟؟

دادا ہر کسی کے ساتھ بہت ہی نرمی سے پیش آتے۔ میں نے دادا کو غصے کی حالت میں صرف ایک بار دیکھا ہے جب جامعۃ الفلاح کے ۵۰ سال مکمل ہونے پر ''گولڈن جبلی'' کا انعقاد کیا گیا تھا۔ پروگرام میں دادا کے ساتھ میں بھی گیا تھا۔ دادا کو سامعین میں دیکھ کر ایک شخص تیزی سے آیا کہ، ''دادا آپ اسٹیج پر تشریف لے آئیں''۔ دادا نے بھی مذاقاً کہہ دیا، ''میں کیوں جاؤں؟ تم ہی چلے جاؤ''۔ پھر اس شخص نے کہا، ''ارے آپ اسٹیج پر نہیں جائیں گے تو اور کون جائے گا؟ جامعۃ الفلاح کو یہاں تک پہنچانے والے آپ ہی تو ہیں؟'' اس پر دادا نے ذرا سختی سے کہا، ''ہاں تو اسٹیج پر بیٹھنے کے لیے تھوڑی نہ کچھ کیا ہے۔'' شاید یہی وجہ ہے کہ دادا کا کام تو دکھائی دیتا ہے مگر نام نہیں۔

بلاشک وشبہ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ پاکیزہ صورت کے بہت لوگ پائے جاتے ہیں مگر دادا جیسی پاکیزہ سیرت آج کے دور میں شاید ہی کسی کی ہو۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ جامعۃ الفلاح کو فلاح کا بہترین ذریعہ بنائے، مسجد بلال کو تا قیامت قائم رکھے، گلشنِ اطفال کو ہر ضرورت مند طفل کے لیے بہترین گلشن بنائے۔ دادا کی مکمل مغفرت فرمائے، قبر کو نور سے منور فرمائے، نامہ اعمال داہنے ہاتھ میں عطا کرے، عرش کے سائے میں جگہ عنایت فرمائے، روز محشر حضرت محمد ﷺ کی شفاعت نصیب فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین یارب العالمین

آہ! خاموشی سے کام کرنے والے ڈاکٹر خلیل احمدؒ

شاہد علیگ

ڈاکٹر خلیل احمد صاحب ۱۹۳۱ء میں بلریا گنج میں پیدا ہوئے۔ ڈاکٹر موصوف کی ابتدائی تعلیم بلریا گنج میں ہوئی، بعد میں اعظم گڑھ کا رخ کیا۔ اعلیٰ تعلیم (علم طب) کے لیے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی گئے۔ وہاں سے ۱۹۵۶ء میں طب کی ڈگری لے کر بلریا گنج آئے۔ موصوف بلریا گنج و اطراف کے مشہور اور کامیاب معالج تھے۔ خاص بات یہ ہے کہ علی گڑھ کی واپسی سے ہی وہ ''تعلیمی تحریک کے لیے بے حد کوشش کرتے رہے۔ یہاں مدرسہ جامعۃ الفلاح میں ثانوی اور اعلیٰ کی کلاسس شروع ہوگئی تھیں۔ ڈاکٹر مرحوم کی کوشش تھی کہ طلبہ میں دینی علوم کے ساتھ ساتھ عصری علوم کی رغبت پیدا ہو۔ وہ جامعہ کو ایک ایسی درسگاہ دیکھنا چاہتے تھے جو جدید اور قدیم کا سنگم ہو، چنانچہ شروع سے ہی تعلیمی اوقات کی تقسیم اس طرح کی گئی کہ آٹھ گھنٹیوں میں سے چھ دینی مضامین کے لیے ہوں اور دو عصری مضامین کے لیے ہوں تاکہ یہاں کے طلبہ ایک طرف قرآن وسنّت کا گہرا علم رکھیں اور ان کے اندر احیائے دین کا جذبہ ہو تو دوسری طرف ان کی نظر وقت کے اہم مسائل پر بھی ہو۔ مرحوم کی یہ دور اندیشی تھی۔ آج کل بہت سی جماعتیں جیسے جمعیۃ علماء ہند اس بات پر زور دے رہی ہیں کہ مدارس میں بھی عصری علوم کی تعلیم ہو۔ ڈاکٹر صاحب کو ۱۹۶۳ء میں مجلس شوریٰ نے جامعہ کا ناظم منتخب کیا۔ انھوں نے اپنی نظامت میں بہت سے تعمیری کام کروائے۔ شیخ منیر (معتمد مال) کو لے کر جامعہ کے تعمیراتی کام کے سلسلے میں حیدرآباد اور دوسرے بڑے شہروں کے سفر کیے، وہاں سے سول انجینئر کو بلریا گنج لے کر آئے۔ وہ خود تعمیراتی کام کے وقت بہ نفس نفیس موجود رہتے۔ ''عصری تعلیم'' ہمارے مدارس کے طلبہ بھی حاصل کریں اس کے لیے مرحوم نے جامعہ کا پروانچل یونیورسٹی جونپور سے الحاق کروایا۔ اس کے علاوہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی،

اور جامعہ ملیہ اسلامیہ سے بھی جامعہ کا الحاق کروایا۔

موصوف کے اندر امانت داری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ جو امانت کا وسیع مفہوم ہوتا ہے وہ اس کا پورا خیال رکھا کرتے تھے۔ ذرہ برابر بھی امانت میں خیانت نہیں کرتے تھے۔ کبھی عہدہ کا غلط استعمال نہیں کرتے تھے۔ کبھی بھی مدرسہ کی چیزوں کو اپنے لیے استعمال نہیں کیا۔

موصوف شبلی کالج کی ایگزیکٹیو کمیٹی کے ممبر تھے۔ راقم (داماد) بی۔اے۔ اور بی لب (B.Lib.) تھا۔ ۲۰۰۰ء میں شبلی کالج لائبریری میں vacancy آئی۔ راقم نے درخواست دی۔ موصوف نے کہا کہ ''پورے process کے ذریعہ تقرری ہوتو بہتر رہے گا۔'' یعنی انھوں نے ایگزیکٹیو ممبر (اختیار) ہونے کے باوجود کوئی غلط راستہ اختیار نہیں کیا۔

موصوف وقت کے پابند تھے، جلدی سوتے اور سویرے جاگتے۔ تہجد کی پابندی کرتے اور سب کو بیدار کرنا ان کا معمول رہتا تھا۔ مرحوم میں 'اخلاص' بہت تھا۔ نیت صاف اور مخلص۔ نام ونمود سے بچتے تھے۔ بقول مولانا عنایت اللہ اسد سبحانی صاحب ''ڈاکٹر خلیل احمد مرحوم رات کی رانی پھول کی طرح تھے۔''

اہل خانہ سے لے کر آس پڑوس کے لوگوں کی تعلیم وتربیت کرتے۔ تقریباً ۹۲ سال کی عمر پائی۔ اچھی اور عمل سے بھرپور زندگی بسر کی۔ اللہ ان کی ملی اور سماجی خدمات کو قبول فرمائے۔ اللہ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور ملت اسلامیہ کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے۔ آمین یارب العالمین۔

آہ! میرے نانا

خبیب شاہد شیخ

نانا خاموش طبیعت اور اعلی اخلاق کے حامل تھے۔ وہ نظم وضبط کے پابند اور بہت ہی امانت دار، دیانت دار، متقی و پرہیز گار تھے۔ معاشی خوشحالی ہونے کے باوجود وہ ایک سیدھے سادے اور پختہ مسلمان کی سی زندگی بسر کی۔ اس سوشل میڈیا کے دور میں بھی اپنے آپ کو اور اپنے کاموں کو شہرت اور نمود ونمائش سے بچائے رکھا۔

نانا اکثر موسم سرما میں بلریا گنج سے ممبئی آیا کرتے تھے۔ ممبئی آتے تو ان سے بہت سی نصیحت اور عمدہ باتیں سیکھنے کو ملتیں۔ وہ پڑھائی کے متعلق گفتگو کرتے اور جنرل نالج بڑھانے پر زیادہ زور دیتے۔ وہ پوچھتے، خبیب کس کلاس میں ہیں؟ کتنے نمبرات سالانہ امتحان میں لائے ہیں؟، حالانکہ اللہ کے کرم سے میرے اچھے نمبرات آیا کرتے لیکن نانا کہتے اس سے زیادہ کوشش کرو اور مزید محنت کرو۔ ان کی اسی تعلیم سے رغبت دلانے کی وجہ سے آج میں الحمدللہ میڈیکل اسٹوڈنٹ ہوں۔

نانا کہا کرتے تھے مچھلی اور شہد کھایا کرو۔ مچھلی غذائیت سے بھرپور ہے۔ اس سے ذہانت بڑھتی ہے۔ دسترخوان پر کھانے کا کوئی دانہ گر جاتا تو اٹھا کر کھا لیتے۔ پلیٹ خوب اچھی طرح صاف کرتے۔ اس سے مجھے بھی پلیٹ صاف کرنے کی عادت پڑ گئی۔

نانا تعلیم پر زور دیتے اور خود بھی مطالعہ کرتے رہتے۔ ان کے زیر مطالعہ ماہنامہ زندگی نو، Radiance اور دعوت اخبار ہوتا تھا۔ پابندی سے تہجد پڑھنے کے ساتھ ساتھ روزانہ قرآن کی تلاوت کرتے۔ مجھے نماز کی پابندی کی تاکید کرتے تھے۔ دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ عصری تعلیم کی طرف توجہ دلاتے اور کہا کرتے تھے کہ جس بھی فیلڈ میں جاؤ چاہے ڈاکٹر بنو یا انجینئر، دین کو ساتھ لے کر چلو۔ میں NEET کی تیاری "شاہین گروپ آف انسٹیٹیوشن" بیدر کرناٹک سے کر رہا تھا۔ نانا

بیدر شاہین کالج دیکھنے آئے اور مجھ سے فرمایا، میڈیکل کی پڑھائی کرنی ہے تو محنت کر کے اچھے مارکس لاؤ اور M.B.B.S. کرو۔ ان کی تاکید، دعاؤں اور اللہ کے کرم سے میرا پچھلے سال M.B.B.S. میں داخلہ ہوگیا۔ کاش کہ نانا زندہ ہوتے اور مکمل پڑھائی دیکھ پاتے۔

نانا کی تعلیمی اور سماجی خدمات بہت زیادہ ہیں۔ انہیں یتیموں سے بے حد لگاؤ تھا۔ انہوں نے ''گلشن اطفال'' قائم کیا۔ ''جامعۃ الفلاح'' کی تاسیس میں شریک رہے اور وہاں کئی بار ناظم رہے۔ یہ تمام چیزیں ان کے لیے نجات کا ذریعہ بنیں گی، ان شاء اللہ۔

اللہ تعالیٰ ان کی خدمات کو قبول فرمائے، ان کے درجات کو بلند فرمائے۔ جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین اللہم آمین

والدمحترم: کچھ یادیں کچھ باتیں

درخشاں خلیل

اس وسیع وعریض فانی دنیا میں کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو مر کر بھی زندہ رہتے ہیں۔ وہ اپنی عمر پوری کر کے اس دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں لیکن ان کی بے پایاں خدمات کی وجہ سے ان کے وجود کو محسوس کیا جاتا ہے۔ وہ سایہ دار درخت کے مانند ہوتے ہیں جن کا سایہ دور دور تک پھیلا ہوا ہوتا ہے۔ جب وہ رخصت ہوتے ہیں تو ایک دنیا ان کے جانے پر سوگوار ہوتی ہے اور مدتوں ان کی یادیں دلوں کو تڑپاتی ہیں۔ ہمارے والد جناب ڈاکٹر خلیل احمد صاحبؒ اسی قسم کے انسان تھے۔ اللہ تعالی نے آپ کو ظاہری اور باطنی بہت ساری خوبیوں سے نوازا تھا۔ اس مختصر سے مضمون میں انہیں کو خراجِ تحسین پیش کرنا چاہتی ہوں۔

ہمارے والد صاحب بڑے ہی با تدبیر، انسان دوست اور ملنسار شخصیت کے مالک تھے۔ ان کے دل میں ملّت کا درد تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ ملّت کے بچّے دینی اور دنیوی تعلیم میں ترقی کریں۔

ابّا جان نے ہم سب بھائی بہنوں کی تربیت بہت ہی عمدہ انداز میں کی۔ مجھ سے چار بڑے بھائی ہیں اور دو چھوٹی بہنیں ہیں۔ تمام بھائیوں نے جامعۃ الفلاح میں پڑھنے کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے اعلی تعلیم حاصل کی۔ ماشاءاللہ ہم تینوں بہنوں نے جامعۃ الفلاح سے فضیلت کی۔ ابّا جان ہمیشہ خود صبح سویرے اٹھتے، سب کے کمروں کو کھٹکھٹاتے اور نماز فجر کے لیے بیدار کرتے۔

گاؤں کے مکانات بڑے ہوتے ہیں، برآمدے، آنگن، کمرے وغیرہ ان کی تربیت کا الگ انداز تھا، صفائی کی طرف دھیان دلاتے اور کہتے ''جھاڑو سے کھیلنا آتا ہے؟ کبھی کبھی جھاڑو سے بھی کھیلا کرو۔ اس کھیل سے صفائی بھی ہو جاتی ہے، دیکھنے میں بھی بھلا لگتا ہے اور اللہ تعالی بھی خوش ہوتے ہیں''۔ پردے کا خاص اہتمام کرواتے کہیں جانا ہوتا تو ساتھ لے کر جاتے یا کسی کے ساتھ بھیجتے۔ اور مجھ

سے کہتے کہ جب بھی تم کو ہنگائی پور سے آنا ہو (اس وقت سواریاں کم ہوا کرتی تھیں، راستہ بھی نہ تھا) تو مجھے اطلاع کرو میں تمھیں لینے آجاؤں گا۔ اکثر فجر کی نماز کے بعد ہی ہنگائی پور آجاتے اور مسجد میں نمازیوں سے ملاقات کرتے اور انھیں اسلامک لٹریچر تقسیم کرتے۔

ابّا جان ہم بہنوں کے کام کاج اور کوششوں کی موقع بہ موقع تعریف کیا کرتے تھے۔ ستائش کے ساتھ غلطی پر برجستہ ٹوک دیا کرتے اور اچھے انداز میں اصلاح کیا کرتے تھے۔ اب وہ سرپرستی نہیں رہی اور وہ خلا کبھی پورا نہیں گا۔

ہماری والدہ محترمہ بڑی ہی نیک خاتون تھیں۔ ۲۴ر دسمبر ۲۰۱۳ء میں انھوں نے اس دار فانی کو الوداع کہہ دیا۔ اللہ تعالی ان کی مغفرت فرمائے، ان کی قبر کو نور سے بھر دے اور ان کو جنّت الفردوس میں اعلی مقام عطا فرمائے۔ (آمین) یہ ہم لوگوں کے لیے بہت ہی دردناک سانحہ تھا۔ جب وہ حیات تھیں تو ابّا جان میری والدہ کے انتظام وغیرہ کی بہت تعریف فرماتے اور کہتے کہ تمہاری والدہ نے کبھی کوئی فرمائش نہیں کی، وہ بہت ہی کفایت شعار ہیں اور بڑی ہی صبر دار ہیں۔

ابّا جان کو یتیموں سے بے حد لگاؤ تھا۔ کبھی کبھی (مذاقا) خود کو بھی یتیم کہا کرتے تھے۔ کئی یتیم بچیوں کی پرورش انہوں نے اپنے گھر میں کی۔ ان کا نسواں جامعۃ الفلاح میں داخلہ بھی کروایا۔ مناسب تعلیم کے بعد ان کی شادی بیاہ کا بھی نظم کیا۔ ایک بچّی (صابرہ) کو اپنے گھر سے ہی رخصت کیا۔ ہماری والدہ محترمہ سے بار بار تاکید فرماتے کہ ان بچیوں کو ہر ڈھنگ سکھاؤ۔ مثلاً سلائی، کڑھائی، بُنائی، نماز کی پابندی اور اچھا کھانا بنانا وغیرہ وغیرہ۔ تاکہ یہ جہاں بھی جائیں خوش اسلوبی سے ہر کام کر سکیں اور انہیں کوئی دقّت پیش نہ آئے۔

ایک خوبی یہ بھی تھی کہ وہ اصول وضوابط کے بڑے پابند تھے۔ کوئی اصول وضابطہ کی خلاف ورزی کرتا تو اس کو برملا ڈانٹ دیتے، چاہے وہ ان کے رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں۔ اصول وضابطہ کی پابندی میں وہ اس حد تک آگے تھے کہ ایک بار میرے بڑے بھائی ڈاکٹر انیس الرحمٰن متعلم درجہ چہارم نے کسی ضابطہ کی خلاف ورزی کی۔ ماسٹر اکرامُ الدین صاحب کا زمانہ تھا، وہ جامعۃ الفلاح میں نائب صدر مدرس تھے اور انہوں نے میرے بھائی کی پٹائی کر دی اور ضابطہ کی خلاف ورزی یہی تھی کہ غیر بورڈر طلبہ کو بورڈنگ میں جانے کی اجازت نہیں تھی، میرے بھائی اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ اندر

چلے گئے تھے انہیں کوئی ضابطہ اور قانون بھی نہیں معلوم تھا۔ ابّا جان کو جب معلوم ہوا تو انھوں نے میرے بھائی کو پیار سے ڈانٹا اور سمجھایا کہ ضابطہ سب کے لیے یکساں ہے۔ یعنی کسی بھی طرح کی طرف داری یا حمایت نہیں کی۔

غرباء اور مساکین سے ہمدردی ومحبت ان کے اندر کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ چنانچہ ایک مرتبہ نسواں کی ایک دائی ہمارے گھر آئی، اس نے ہم لوگوں سے اپنی پریشانی کا تذکرہ کیا اور کہا ''جب میں خالی رہتی ہوں اور کہیں کوئی کام مل جاتا ہے تو کر لیتی ہوں آپ لوگوں کے یہاں کوئی کام ہو تو بتایئے۔'' میں نے اس سے کہا کہ ابّا سے پوچھ کے بتائیں گے۔ ابّا جان گھر میں موجود ہی تھے انھوں نے فوراً سوال کیا کہ یہ کون ہیں؟ جب ان کو بتایا گیا کہ یہ نسواں کی دائی ہیں اور دائی نے اپنی پریشانی دُہرائی۔ تو ابّا جان نے والدہ محترمہ کو ایک طرف بلایا اور کہا ''کوئی ضروری نہیں ہے کہ وہ گھر پر کام کرے تبھی اس کو کچھ دیا جائے، جب بھی اس کو پریشان دیکھو اس کی مدد کر دیا کرو۔ نسواں کا ملازم نسواں میں ہی رہنا چاہیے، ایسا نہ ہو کہ لوگوں کو شبہہ گزرے کہ مدرسہ کے ملازم سے یہ لوگ اپنا کام کرواتے ہیں۔'' ابّا جان اس قدر محتاط زندگی گزارتے تھے۔

ابّا جان تحریک اسلامی سے وابستہ تھے۔ وہ جماعت اسلامی کے فعّال رکن تھے۔ جب تک صحت نے ساتھ دیا اس کے ہر پروگرام میں جاتے رہے اور ہم لوگوں کو بھی ترغیب دیتے تھے کہ جماعت کے پروگرام میں شرکت کیا کرو۔ مطالعہ کا بڑا شوق تھا۔ پابندی سے تفہیم القرآن، دعوت (اخبار)، زندگی نو اور اس کے علاوہ دوسری متعدد کتابوں کا مطالعہ کیا کرتے۔ کچھ کتابیں اور ڈکشنری اپنے تکیہ کے پاس رکھتے۔ گھر، خاندان، آس پڑوس کے لوگوں کو اچھی باتیں بتاتے، نیک کاموں کی یاد دہانی کراتے اور برے کاموں سے باز رکھنے کی کوشش کرتے، لوگوں کے حالات سدھارنے، انھیں نیک کاموں کی طرف راغب کرنے اور انھیں برائیوں سے دور رہنے کی تاکید فرماتے۔

ابّا جان نے جو بھی کام کیا اخلاص کے ساتھ کیا اور ہمیں بھی وہ اس بات کی تاکید کیا کرتے تھے۔

دین کی راہ میں جو انھوں نے خدمات انجام دیں اللہ تعالیٰ انہیں قبول فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور ہم پسماندگان کو ان کی خوبیوں کا وارث بنائے۔ (آمین یارب العالمین)

ابا مرحوم

عظمی خلیل

ہم چار بھائی اور تین بہنوں میں، میں سب سے چھوٹی تھی۔ چھوٹے ہونے کی وجہ سے سبھی لوگ شفقت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ میرا نام تو عظمی خلیل ہے پر گھر میں لوگ پیار سے رمّی کہتے ہیں۔ جب میں نے ہوش سنبھالا تو دیکھا کہ خاندان کے تمام افراد ایک ہی گھر میں رہتے تھے جو دو آنگن پر مشتمل ایک بڑا کشادہ مکان تھا۔ جس میں ہمارے دونوں دادا کی اولاد ایک ساتھ رہتی تھی۔ بڑے دادا جن کا نام عبدالسلام تھا ان کے تین بیٹے تھے جن کے نام یہ ہیں عبدالرشید (ابا)، ماسٹر فرید (ابا)، حفیظ (ابا)۔ بڑے دادا کو میں نے دیکھا ہی نہیں لیکن میرے دادا جن کا نام عبدالحمید تھا، الحمدللہ ان کا سایہ ہم لوگوں پر بہت سالوں تک رہا۔ دادا کی بہت سی باتیں اور نصیحتیں اب بھی یاد ہیں۔

میرے ابا اپنے والد کے اکلوتے بیٹے تھے لیکن ان چار بھائیوں میں جو محبت تھی اور جو میل جول تھا وہ ایک مثال تھی، الحمدللہ آخر دم تک قائم رہی۔ ابا کے پھوپھی زاد بھائی جن کا نام ماسٹر جلیل صاحب تھا اکثر شام میں ہمارے گھر آجایا کرتے ہیں۔ ابا سے عمر میں بڑے تھے لیکن بے تکلفی تھی۔ ابا اور جلیل صاحب میں علمی گفتگو ہوتی تھی۔ کبھی عصری علوم کے نصاب پر، کبھی حکومت کی نئی تعلیمی پالیسی پر۔ غرض کہ کبھی کبھار بحث و مباحثہ طویل ہو جاتا۔ جلیل ابا نے ایک عصری علوم کا اسکول (نور پبلک اسکول) قائم کیا، جو آج تک جاری ہے۔

ابا کو نام ونمود سے بچنے کی خاص عادت تھی۔ البتہ انتظامی امور خوش اسلوبی سے انجام دیتے تھے۔ متقی، پرہیز گار، متواضع اور ملنسار تھے۔ جامعۃ الفلاح کی ترقی کے حسین خواب دیکھتے تھے اور اس کے لیے بے حد فکر مند رہتے تھے۔ جس طرح وہ اپنے گھر خاندان اور پڑوس کے بچوں کی تعلیم کا خیال کیا کرتے تھے۔ اس طرح آس پڑوس کے بچوں کو بلاتے اور ان کی تعلیم کے بارے میں دریافت کرتے۔ مالی پریشانی کے بارے میں پوچھتے۔ ان کے تعلیمی حوصلے کو بڑھاتے، ذرا بھی تصنع سے کام نہیں لیتے۔

ہماری والدہ محترمہ بہت نیک اور اطاعت گزار تھیں۔ ان کے رخصت ہونے سے جو دکھ ہوا اس کا اظہار مشکل ہے۔ والدہ کی رحلت کے ایک سال بعد ابا جان کی طبیعت خراب ہوگئی (یہ تقریباً ۹ سال پہلے کی بات ہے۔) فوراً ہی میرے بھائی ابا کو لے کر اعظم گڑھ ہسپتال گئے۔ ڈاکٹر کے مشورے کے بعد ابا کو ایڈمٹ ہونا پڑا اور ایسا لگ رہا تھا کہ اب صحت یاب نہیں ہو پائیں گے۔ ابا جان کی زبان پر کلمہ، دعائیں اور خدا کا شکر جاری تھا۔ جب افاقہ نہیں ہوا تو ڈاکٹر شہاب الدین کے ہسپتال میں منتقل کیا گیا۔ اللہ کی رحمت جوش میں آئی اور ابا جان کی طبیعت ٹھیک ہونے لگی۔ اور الحمدللہ مکمل طور پر صحت یاب ہو کر گھر واپس آ گئے۔

جس رات یہ سانحہ پیش آیا اسی دن بڑے ابا کی بیٹی خالدہ باجی اور عذرا بھابھی ملنے آئی تھیں۔ ان لوگوں سے ابا جان کی بات چیت بھی ہوئی۔ شام میں اتفاقاً میں بڑہریا سے بلریا گنج آئی۔ اور اتفاقاً لبنیٰ باجی بھی بندول سے بلریا گنج آ گئیں۔ ابا جان سب کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ سب کے ساتھ مل کر رات کا کھانا بھی کھایا۔ کھانے کے بعد ہم سب اپنے گھر واپس چلے گئے۔ رخصت ہوتے وقت ابا جان سے اجازت چاہی تو ابا اس بار کچھ نہ بولے، جب کہ ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ ''میں کیسے جانے کے لیے کہوں۔''

تین گھنٹے بعد فون آیا کہ ابا کی طبیعت خراب ہے۔ جب میں بلریا گنج پہنچی تو ابا جان اس دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ اللہ غریق رحمت کرے۔ ان کی یادیں اور نصیحتیں دماغ میں گھومتی رہتی ہیں۔ اب صرف ابا جان کا کمرہ، ان کی چارپائی، کچھ دوائیاں اور کتاب کی الماری ہے۔ ماں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا اللہ تعالیٰ دونوں کی مغفرت فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ ہمیں صبر جمیل عطا فرمائے اور ان کی مغفرت کا ذریعہ بنائے۔ آمین ثم آمین

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

ڈاکٹر فاطمہ عتیق الرحمٰن خان

ڈاکٹر خلیل احمد صاحب ایک ماہر طبیب تھے لیکن تعلیم کے میدان میں بھی ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ تمام مسلمان تعلیم کے میدان میں اپنی دینی شناخت کے ساتھ آگے بڑھیں، انھیں دینی و دنیوی علوم کے حصول کے بہترین مواقع حاصل ہوں۔ کہا جاسکتا ہے کہ جامعۃ الفلاح اسی خواب کی تعبیر ہے۔ جامعۃ الفلاح کی تعمیر میں انھوں نے ایک اہم کردار ادا کیا۔ نظامت کی ذمہ داری بھی سنبھالی اور جامعہ کی فلاح و بہبود کے لیے ہر طرح کی قربانیاں بھی پیش کیں۔ جامعۃ الفلاح کی اسناد کو مختلف یونیورسٹیوں سے تسلیم کروایا اور اس طرح طلبہ کے لیے مواقع کی ایک نئی دنیا آباد کی۔ الغرض مسلمانوں میں تعلیم کو پروان چڑھانے کے لیے انھوں نے بہت سے کام کیے ہیں۔ ان کے نزدیک ڈگریاں اکٹھا کرنے کا نام علم حاصل کرنا نہیں تھا۔ بلکہ علم کو کس طرح روزمرہ کی زندگی میں ڈھالا جائے، یہی تعلیم کا اصل مقصد تھا۔

ان کے پاس علم کی جو بیش بہا دولت تھی، اسے انھوں نے صرف اپنے تک محدود نہیں رکھا بلکہ اس قیمتی سرمائے کو انھوں نے آس پاس کے لوگوں، پڑوسیوں، رشتہ داروں اور متعلقین تک حتی الامکان پہنچانے کی مکمل کوشش کی۔ گویا انھوں نے ہر طرح سے پتھروں کو تراش کر لعل بنانا چاہا۔ اور بڑی حد تک کامیابی حاصل کی۔ ان کی نظر میں تعلیم ایک ایسا پھول ہے جس کی خوشبو محدود نہیں رہنی چاہیے، دور دور تک پھیلنی چاہیے۔ ان کا یہ کہنا تھا کہ علم حاصل کرنے کی کوئی عمر نہیں ہوتی بلکہ ہر وقت انسان کو کچھ نہ کچھ سیکھتے رہنا چاہیے۔ غرض کہ مہد سے لحد تک علم حاصل کرنے کو وہ ترجیح دیتے تھے۔ ان کا خود کا بھی یہی شیوہ تھا کہ ہر وقت مطالعہ کرتے ہوئے نظر آتے تھے – چاہے دینی کتب کا ہو یا طبی، زبان چاہے

انگلش ہو یا اردو۔ان کی ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ شہرت و ناموری سے دور بھاگتے تھے۔

جماعت اسلامی یا جامعۃ الفلاح کے لیے ان کی بڑی خدمات رہیں،لیکن کبھی انھوں نے اس طرز پر نہیں سوچا کہ لوگ انھیں جانیں یا ان کی خدمات کا اعتراف کریں۔ان کے ذہن میں مسلمانوں کی تعلیمی ترقی اور ان کی خوشحالی ہوتی،اس مقصد کے لیے وہ اپنا کام کیے جاتے اور چاہتے کہ کسی کو کچھ پتہ نہ چلے۔انھوں نے قوم کی بھلائی کے لیے ''گلشن اطفال'' (یتیم خانہ) اور مسجدیں بھی تعمیر کروائیں۔

یہ میرے لیے سعادت کی بات ہے کہ یہ عظیم شخصیت کوئی اور نہیں بلکہ میرے اپنے دادا تھے۔ ان کی تعلیمی خدمات سے گھر کی دنیا بھی آباد تھی۔وہ چھوٹے بچوں کو اور اپنے پوتے پوتیوں کو کتابیں فراہم کرتے تھے اور مطالعہ کی ترغیب دیتے تھے۔ان کے گھر میں اگر کوئی ملازمہ بھی آتی تو جامعۃ الفلاح میں داخلہ کرا کے اس کی تعلیم و تربیت کا نظم کرتے تاکہ اس کے بھی اخلاق و کردار علم کی روشنی سے منور ہو جائیں۔

انھوں نے بہت سی اچھی باتیں اپنے قول و عمل سے لوگوں تک پہنچائی ہیں۔ایک واقعہ جو میں نے انھی کی زبانی سنا مجھے اچھے سے یاد ہے۔ایک شخص ان کے پاس جامعۃ الفلاح میں اپنی بیٹی کی فیس معاف کرانے آیا تھا۔وہ پان چبا رہا تھا۔جب اس نے مدعا پیش کیا تو دادا نے پوچھا کہ دن بھر میں کتنے پان کھا لیتے ہیں آپ؟ اس نے تعداد بتائی۔اس پر دادا نے حساب کتاب لگا کر اس سے کہا کہ مہینے میں جتنے کا آپ پان کھا لیتے ہیں آپ کی بیٹی کی تعلیمی فیس اس سے کم ہے۔یہ ان کا طرز تھا کہ ہلکے پھلکے انداز میں بھی لوگوں کو ضروری باتیں سمجھا دیا کرتے تھے۔

جب میں سات سال کی تھی تب وہ دادی اور بابا (ان کے والد صاحب) کے ساتھ حج کرنے آئے تھے۔تب ہم جدہ (سعودی عرب) میں ہی رہتے تھے۔اس وقت بھی وہ میرے لیے اور میری بہن کے لیے بہت سی کتابیں لے کر آئے تھے۔وہ نہ صرف ہمیں کتابیں دیتے تھے بلکہ پڑھوا کر سنتے بھی تھے اور اس میں لکھی باتیں سمجھاتے بھی تھے۔اور باتوں ہی باتوں میں تعلیم و تربیت کا راستہ بھی ڈھونڈ لیتے تھے۔جب بھی کوئی جدہ آتا،وہ ہمارے لیے ضرور سبق آموز کتابیں بھیجا کرتے تھے۔دادا چھوٹی چھوٹی باتوں پر دھیان دیتے تھے۔بچپن میں ایک مرتبہ میں بلریا میں نماز پڑھ رہی تھی،دادا اندر آئے تو میری نماز کا جائزہ لینے لگے۔پھر انھیں نماز میں جو کمی نظر آئی اسے درست کروایا اور بتایا کہ ایسے

نہیں ایسے کرتے ہیں۔

جب ہم جدہ سے ممبئ منتقل ہوگئے، اور یہاں اسکول میں میرا داخلہ ہوا تب مجھے انگلش میں بڑی دقتیں پیش آئیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جدہ میں عربی میڈیم ہونے کی وجہ سے انگلش سے کبھی کوئی رابطہ ہوا ہی نہیں تھا۔ پانچویں جماعت پاس کرکے میں ہندوستان آئی تھی اور انگلش بالکل ابتدا سے شروع کرنی پڑی۔ ہمیں انگلش سکھانے کے لیے دادا نے خوب محنت کی۔ انھوں نے بالکل شروعات سے ہمیں انگلش کی تعلیم دی۔ Tenses سمجھائے، جملے بنانے کی مشق کرائی۔

انھی کے مشورے سے ہم دونوں بہنوں نے طب (B.U.M.S) میں داخلہ لیا۔ وہ ممبئ آتے تو ہم لوگوں سے طب کے تعلق سے سوالات بھی کیا کرتے تھے۔ ایک دن انھوں نے ادویہ سے متعلق ایک سوال پوچھا جس کے جواب میں میں نے کہا کہ ابھی یہ پڑھایا نہیں گیا ہے۔ اس پر انھوں نے مسکرا کر کہا کہ جو پڑھایا جائے اتنا ہی پڑھا کرو، غلطی سے بھی آگے کا کچھ مت پڑھ لینا۔ ان کی اس بات پر ہم سب ہنس دیے، یہ واضح تھا کہ وہ ہمیں طبیہ کالج میں پڑھائے جارہے نصاب کے علاوہ بھی مطالعہ کرنے پر ابھار رہے تھے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ان کی مغفرت فرمائے، ان کے نیک اعمال کو قبول کرے، ان کی قبر کو وسعت بخشے، ان کے لیے جنت کی کھڑکیاں اور دروازے کھول دے، انھیں جنت میں اعلیٰ درجات نصیب کرے، اور ہماری دعاؤں کو ان کے حق میں قبول فرمائے! آمین، ثم آمین۔

اک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا

خان صائمہ عتیق الرحمٰن

مجھے یاد ہے کہ جب سے میں نے ہوش سنبھالا بَھیّا کو کتابوں کا شوقین پایا۔ گھر میں بَھیّا کی بہت بڑی لائبریری ہے۔ جس میں ہر مضمون اور ہر طرز کی کتابیں ہیں۔ بَھیّا خود تو کتب بینی کا شوق رکھتے ہی تھے، چھوٹے پر سے ہی ڈانٹ ڈپٹ کر مجھے بھی اس کا عادی بنا دیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے بھی بہت کچھ جاننے اور سیکھنے کا موقع ملا۔ بچپن میں جب میں بڑی اور معروف شخصیات اور ان کی خدمات کے بارے میں پڑھتی اور سنتی تھی تو ہمیشہ یہ حسرت مجھے آ گھیرتی تھی کہ کاش میں بھی ان شخصیات سے بذات خود روبرو ہو پاتی۔ ان کے خیالات و افکار سے ذاتی طور پر استفادہ کر پاتی!!! لیکن جب عقل اور سمجھ نے بچپن کی حسرت سے درکنار ہو کر اپنے اردگرد دیکھا تو پایا کہ ایسی ہی ایک عظیم شخصیت سے روبرو ہونے کی میری دعا تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے پہلے ہی سے قبول کی ہوئی ہے، بس میں ہی لاعلمی کا شکار رہی۔ دادا یعنی ڈاکٹر خلیل احمد مرحوم ایک مثالی اسلامی شخصیت تھے۔ تعلیم کے میدان میں ان کی خدمات گراں قدر ہیں۔ وہ بذات خود بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ ۱۹۵۶ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے BUMS کی ڈگری حاصل کر کے جب اپنے آبائی وطن واپس لوٹے تو اپنی پوری زندگی غریب غرباء، مسکینوں اور یتیموں کی نذر کر دی۔ وہ جامعۃ الفلاح کے معماروں میں سے ایک، جماعت اسلامی کے رکن، شبلی کالج کے رکن عاملہ، گلشن اطفال نامی یتیم خانہ کے سرپرست اور بہت کچھ تھے۔ ۱۹۶۳ء سے ۲۰۰۰ء کے درمیان تین دفعہ وہ جامعۃ الفلاح کے ناظم مقرر ہوئے۔ انہوں نے جامعۃ الفلاح کی مجلس شوریٰ میں بھی ایک اہم کردار ادا کیا۔ یہ بات میرے لیے قابل فخر ہے کہ میں ایسی عظیم و شفیق شخصیت کی پوتی ہوں۔

دادا ۲۸ اور ۲۹ مئی ۲۰۲۳ء کی درمیانی رات کو تقریباً ساڑھے بارہ بجے اس دار فانی سے کوچ

کر گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون ۔ یہ دردناک خبر سنتے ہی سب کا غم سے برا حال ہو گیا۔ امی اور ابو کے غم کا تو شاید ہم اندازہ بھی نہیں لگا سکتے۔ والدین کے بچھڑ جانے کا تصور ہی انسان کو اندر تک جھنجھوڑ دیتا ہے۔ امی ابی کو تکلیف میں نڈھال اور روتا دیکھ کر میں سمجھنے سے قاصر تھی کہ ان کو سنبھالوں، انھیں حوصلہ دوں یا اپنے نقصان پر آنسو بہاؤں۔ اس ہولناک خبر کو سنتے ہی ساری ہمت ٹوٹ گئی تھی، سر سے ایک شفیق اور بے لوث سایہ اٹھ جانے کا یہ احساس بڑا تکلیف دہ تھا، لیکن: 'رہنے کو سدا دہر میں آتا نہیں کوئی'

میرے دادا ڈاکٹر خلیل احمد مرحوم ہر دلعزیز شخصیت کے مالک تھے۔ وہ صاف گو، کفایت شعار، پرعزم، سادہ مگر اعلیٰ شخصیت کے علمبردار تھے۔ اب تک ان کی یاد میں کئی تعزیتی پروگرام منعقد کیے جا چکے ہیں، ان کی خدمات اور شخصیت کے متعدد پہلوؤں پر تحریریں بھی لکھی گئی ہیں۔ مجھے بھی بہت کچھ لکھنا ہے۔ خیالات، یادیں، واقعات دماغ میں گردش کر رہے ہیں لیکن قلم چلنے سے قاصر ہے۔ قلم کی سیاہی کے بجائے آنسو ہیں جو کاغذ کی زینت بنتے جا رہے ہیں۔ اسلام کی تاریخ ایسے جانباز، دلیر، صابر، شاکر، اللہ سے محبت کرنے والے اور مضبوط اعصاب کی شخصیات سے لبریز ہے جنھوں نے مشکل سے مشکل وقت میں نہ صرف صبر اور استقامت کا مظاہرہ کیا بلکہ ہر تکلیف، پریشانی اور مصیبت میں بھی اللہ کے حکم اور اس کے دین کو اپنی زندگی کا سب سے اہم حصہ بنائے رکھا، ہر حال میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے فیصلے پر قائم و دائم رہے۔ دادا کی شخصیت بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ ان کی خدمات سے جہاں بہت سے لوگ واقف ہوں گے، وہیں بہت سے لاعلم بھی ہوں گے۔ اس لاعلمی کی وجہ خاص طور پر یہ ہے کہ ڈاکٹر خلیل احمد مرحوم زندگی بھر خاموشی سے قوم وملت کی فلاح و بہبود کے کام کرتے رہے؛ تحریک وتعلیم کے چراغ روشن کرتے رہے لیکن کبھی بھی اس کی داد وصول کرنے کی کوشش نہیں کی، کبھی بھی اپنے کاموں اور خدمات کا ڈنکا نہیں پیٹا۔ ان کا مقصد حیات دنیاوی شہرت نہیں بلکہ حشر کے دن بارگاہ الٰہی میں سرخرو ہونا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آج ان کے نام سے زیادہ ان کے نیک کاموں کا شور ہے۔ اور شاید یہی ایک اعلیٰ ظرف شخصیت کا خاصا ہے۔

میں خود ان کے بہت سے کاموں اور کارناموں سے اچھی طرح واقف نہیں ہوں۔ بس کچھ ذاتی یادیں ہیں جو زندگی کا قیمتی اثاثہ ہیں۔ بچپن میں جب میں بلریا گنج جاتی تو دادا فجر کی نماز کے بعد مجھے لے کر ٹہلنے نکل جاتے۔ ٹہلتے ہوئے راستے میں ملنے والے غریب غربا کی دل کھول کر امداد کرتے۔ ایک دن میں نے دادا سے کہا کہ یہ لوگ کتنے خوش قسمت ہیں کہ آپ روز ان کی مدد کرتے ہیں۔ بات

بہت بے تکی اور بچکانی تھی لہٰذا دادا ہنسنے لگے اور کہا کہ خوش قسمتی تو ہم لوگوں کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں مدد کرنے کا موقع دیا ہے۔ ان کی یہ بات میں نے گانٹھ باندھ لی کہ جتنا بھی اللہ نے ہمیں عطا کیا ہے ہمیں اس پر گھمنڈ نہیں بلکہ شکر کرنا چاہیے، اور اس شکر خداوندی کا لازمی تقاضا اللہ کے بندوں کی خدمت کرنا ہے۔

جس کی ادا ادا پہ ہو انسانیت کو ناز
مل جائے کاش ایسا بشر ڈھونڈتے ہیں ہم

بچپن میں دادا اور میرے بیچ مقابلہ بھی ہوتا تھا۔ وہ اپنی انگلیوں کو بند کر اس کی مٹھی بنا کے میرے سامنے کر دیتے کہ اسے کھولو۔ اور میں ہمیشہ ہار جاتی تھی۔ اس کے بعد دادا کہتے کہ شہروں کے ملاوٹی کھانے سے طاقت نہیں آتی، گاؤں کا گھی مکھن کھاؤ تب جیت پاؤ گی اور پھر مجھے ناچاہتے ہوئے بھی مجبوراً دودھ، انڈا اور نہ جانے کیا کیا کھانا پڑتا۔ دادا اکثر شیروانی اور ٹوپی میں ملبوس ہوتے تھے۔ میں اکثر اس تاک میں رہتی تھی کہ کب دادا اپنی ٹوپی اتار کر رکھیں اور میں جھٹ اسے پہن لوں۔ ان کی ٹوپی پہن کر ایک الگ سی خوشی اور مسرت کا احساس مجھے آگھیرتا تھا۔

دادا کی انگریزی اور گرامر کمال کی تھی۔ اکثر و بیشتر وہ اور میں ایک ٹیم بن کر بھیّا کو انگریزی پڑھاتے تھے۔ اور جب بھیّا سے غلطی ہوتی تو دادا مذاقاً مجھ سے کہتے کہ تمہارے بھیّا کو سزا دینی پڑے گی، تب میں فوراً ٹیم بدل کے بھیا کی طرف داری میں کہتی کہ آپ دوبارہ سکھا دیں نا، اور دادا مسکرا کر اصلاح کر دیتے تھے۔ بھیا کو کتب بینی سے خاصا شغف تھا۔ اور دادا بھی ان کی خاص حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ اکثر و بیشتر وہ مختلف موضوعات پر کتابیں لے آتے اور بھیّا ان کا مطالعہ کرتے۔

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ آج جامعۃ الفلاح کو جو شہرت، عروج اور ترقی حاصل ہے اس میں ڈاکٹر خلیل احمد مرحوم کا اہم کردار رہا ہے۔ ان کی دور اندیشی کا نتیجہ ہے کہ طلبہ و طالبات کو دینی اور دنیوی تعلیمات سے روشناس کرایا جانے لگا۔ دادا بلاشبہ سادہ صفت، خاموش طبیعت کے مالک، ملنسار، غم گسار، اور علم کے بے حد قدر دان تھے۔

چند سال قبل امی ابو کے اصرار پر میں نے کالج سے چھٹی لی اور ہم بلریا گنج پہنچے تو دادا سے Academic Studies سے متعلق تفصیلی بات چیت ہوئی۔ جب میں نے انھیں اپنے Specialization کے لیے History کے انتخاب کی بات بتائی تو عادت کے مطابق انھوں نے

سبجیکٹ سے متعلق مجھ سے بہت سارے سوالات کیے۔ مقصد یہ جانچنا تھا کہ میں نے جو مضمون منتخب کیا ہے اس کے بارے میں معلومات ہے یا نہیں۔ دادا کا ماننا تھا کہ وہ پڑھو جس میں تمھیں دلچسپی ہو۔ تعلیم دنیا کو دکھانے اور بتانے کے لیے نہیں بلکہ اپنے علم میں اضافہ کرنے کے لیے حاصل کی جاتی ہے۔ جب تک میں وہاں رہی وہ روز میرے سبجیکٹ سے متعلق کوئی کتاب، اخبار کا کوئی آرٹیکل، کوئی نیوز جو میرے کام آسکتی ہو مجھے دیتے تھے۔ ان کی ہمیشہ کوشش رہی کہ ہم زیادہ سے زیادہ پڑھیں۔ خوب ترقی کریں۔ اسلام کی خدمت میں سرگرم عمل رہیں۔ وہ ہمیشہ ہماری مدد اور رہنمائی کے لیے تیار رہتے تھے۔ تعلیم کی دولت سے لاعلم پتھروں کو تراش کر علم کے لعل و گہر سے آراستہ کرنا ان کا شیوہ تھا۔ دادا تعلیم کے آسمان پر چمکتا ہوا چاند تھے۔ افسوس کہ وہ چاند ڈوب گیا ہے لیکن تعلیمی میدان میں کیے گئے ان کے کام تاحیات ستاروں کی مانند آسمان میں اپنی روشنی بکھیرتے رہیں گے۔

کئی چاند تھے سر آسماں کہ چمک چمک کے پلٹ گئے

زندگی کے واقعات کو کاغذ پر رقم کرنے کی کوشش کی جائے تو انسان تھک جائے گا لیکن باتیں ختم نہیں ہوں گی۔ مجھے یقین ہے کہ اس عظیم شخصیت کے بارے میں جتنا بھی لکھیں کم ہے۔ بہت خوبصورت دن تھے وہ اور اس سے بھی زیادہ خوبصورت یہ یادیں ہیں۔ وہی یادیں جو جانے والے کے احساس کو زندہ رکھنے کا واحد ذریعہ ہوتی ہیں۔ زندگی ختم ہو جاتی ہے لیکن کسک، افسوس اور حسرت ہمیشہ ہمارے ساتھ رہ جاتے ہیں۔ افسوس نہ وہ دن واپس آسکتے ہیں نہ ہی میں اب کبھی اس شفیق شخصیت کی شفقت سے دوبارہ روبرو ہوسکتی ہوں۔ اب بھی ہم سب کے پاس بہت سی باتیں ہیں جو ہم اس مہربان شخصیت کے ساتھ بانٹنا چاہتے ہیں، بہت کچھ بتانا اور دکھانا چاہتے ہیں۔ لیکن دادا اپنا شفیق سایہ سمیٹ کر ہم سب کو آنسوؤں کے حوالے کر کے اپنے آخری سفر پر روانہ ہو چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے تاحیات یہ دعا رہے گی کہ اس مہربان شخصیت کے ساتھ مہربانی والا معاملہ کرے، ان پر رحم کرے۔ ان کے سارے نیک اعمال کو ان کی بخشش کا ذریعہ بنائے۔ ان کے درجات کو بلند کرے۔ انھیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے۔ ہماری دعاؤں کو ان کے حق میں قبول کرے۔ اور ہم سب کو اس عظیم نقصان کو برداشت کرنے کا حوصلہ عطا کرے۔ آمین!!!

شمع روشن بجھ گئی بزم سخن ماتم میں ہے

صوفیہ خان فلاحی

۲۹ رمئی کو جب یہ خبر ملی کہ ڈاکٹر خلیل احمد صاحب اس دار فانی سے کوچ کر گئے تو یقین نہیں آیا، تھوڑی دیر بعد جب بے یقینی کے بادل چھٹے تو ذہن پر یادوں کے نقوش ابھرنے لگے۔

جامعۃ الفلاح میں جب میرا داخلہ ہوا، اس وقت ڈاکٹر خلیل احمد صاحب ناظم جامعہ کے فرائض سے سبکدوش ہو چکے تھے۔ دوران تعلیم کبھی براہ راست ان کو سننے یا دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ فراغت کے بعد جب میرا نکاح ان کے پوتے ڈاکٹر خان یاسر سے ہوا تب میں نے اس عظیم اور علم دوست شخصیت کو ذرا قریب سے جانا۔ وہ ہمارے نکاح میں شرکت کے لیے ممبئی آئے تھے۔ نکاح سے پہلے دادا (ڈاکٹر خلیل احمد صاحب) سے واقفیت کی ایک اور وجہ یہ بنی کہ وہ میرے بڑے دادا (جناب ریاض احمد خان صاحب) کے تحریکی دوست تھے۔ دونوں بزرگ جماعت اسلامی ہند کے بہت پرانے اور سرگرم ارکان میں سے تھے۔ فکری ہم آہنگی کے ساتھ ساتھ تعلیم وتعلم کے میدان میں سرگرم عمل ہونے کی وجہ سے ہم مذاق بھی تھے۔ دادا جب ہمارے نکاح میں شرکت کی غرض سے ممبئی تشریف لائے تو یہ ان دونوں بزرگوں کی آخری ملاقات تھی۔ اللہ مرحومین کے درجات بلند فرمائے!

دادا کے بارے میں مزید واقفیت خان یاسر صاحب کے ذریعے ہوئی۔ وقتاً فوقتاً دادا کا ذکر ہوتا۔ وہ بتاتے کہ بچپن میں دادا نے کس طرح ان کی تربیت کی۔ دادا ابرا ان کے لیے اخلاقی کہانیوں کے سیٹ بھیجا کرتے تھے جسے وہ بہت شوق سے پڑھا کرتے اور مکمل کرنے کے بعد پھر سے نئی کتابیں بھیجنے کی فرمائش کرتے۔ دادا ان کی تعلیم پر بھی توجہ دیتے تھے، انگلش بھی سکھاتے تھے۔ جب کبھی وہ بلریا گنج جاتے تو ان کا زیادہ تر وقت دادا کے ساتھ ہی گزرتا تھا اور جب ممبئی واپس آتے تو دادا کے ذاتی کتب خانے سے کتابیں ضرور لے کر آتے۔ کہا جا سکتا ہے کہ دادا کی انھی کوششوں کے نتیجے میں یاسر

صاحب کو مطالعہ کا شوق پیدا ہوا اور کتابوں سے ایسی محبت ہوئی کہ اب بھی مطالعے کے بغیر کوئی دن نہیں گزرتا۔ شاید یہی وجہ رہی کہ انھوں نے دور حاضر کی علمی، فکری و تحریکی شخصیات کے تعارف پر مبنی اپنی پہلی کتاب ''جی چاہتا ہے نقش قدم چومتے چلیں'' کو امی اور ابو کے ساتھ ساتھ دادا کے نام سے بھی منسوب کیا۔ دادا پوتے کا یہ رشتہ مجھے بہت خوبصورت لگتا تھا۔

دادا نے اپنی پوری زندگی دین کی خدمت کرتے ہوئے گزاری۔ ان کو فروغ تعلیم سے بہت دلچسپی تھی، جامعۃ الفلاح کی تعمیر و ترقی میں انھوں نے اہم رول ادا کیا۔ گھر میں جب بھی دادا کا ذکر ہوتا ان کے ساتھ جامعۃ الفلاح کا ذکر ضرور ہوتا تھا، دادا دل و جان سے جامعہ کی ترقی کے لیے کوشاں اور اس کے لیے فکر مند رہتے تھے۔ وہ بلریا گنج میں یتیموں کی کفالت کے لیے قائم کردہ ''گلشن اطفال'' کے مؤسس و بانی بھی تھے، پورے خطے میں اپنی نوعیت کا یہ ایک منفرد ادارہ ہے۔ انھوں نے مسجد بلال اور اس میں ایک چھوٹی سی لائبریری بھی قائم کی۔ شبلی کالج کی مجلس عاملہ کے بھی رکن رہے۔ اس کے علاوہ بھی مختلف اصلاحی و فلاحی اداروں سے وابستہ رہے۔ آج کے دور میں جہاں نام و نمود حاصل کرنے اور کریڈٹ لینے کی دوڑ لگی ہوئی ہے دادا کی اہم خصوصیت یہ تھی کہ وہ کبھی اپنی اصلاحی کوششوں یا دینی خدمات کا ذکر نہیں کرتے تھے۔ ''**مخلصین له الدین**'' کی زندہ مثال تھے۔

دادا سے میری ملاقات کم ہی ہوئی۔ پہلی دو تین ملاقاتیں بہت مختصر تھیں، البتہ آخری ملاقاتوں میں دادا سے بہت سی باتیں ہوئیں۔ اس وقت میں دہلی میں تھی اور دادا جامعۃ الفلاح کی شوریٰ کی نشست میں شرکت کے لیے دہلی تشریف لائے تھے۔ ان دنوں دادا کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی، وہ کافی کمزور بھی ہوگئے تھے لیکن پیرانہ سالی، علالت و کمزوری کے باوجود انھوں نے شوریٰ کی نشست میں شرکت کی غرض سے بلریا گنج سے دہلی کا سفر کیا، جو یقیناً ان کے عزم و حوصلے اور دین کی خاطر سچی لگن کی وجہ سے ہی ممکن ہوسکا۔ میری شدید خواہش تھی کہ دادا ہماری قیام گاہ پر ٹھہریں اور اس کے لیے میں نے پہلے سے سارے انتظام بھی کر لیے تھے لیکن کمزوری و نقاہت اور مرکز آنے جانے میں دشواری کے پیش نظر وہ (نشست کے اختتام تک) سب کے ساتھ مہمان خانے ہی میں ٹھہرائے گئے۔ چچا کے ساتھ وہ دو مرتبہ ہمارے یہاں تشریف لائے، اور یہیں سے اسٹیشن کے لیے روانہ ہوئے، اس موقع پر مجھے دادا کی صحبت سے فیضیاب ہونے کا موقع ملا۔

دادا سے ملاقات پر مجھے کبھی اجنبیت کا احساس نہیں ہوا، وہ ہمیشہ ایک مشفق سرپرست کی طرح نظر آئے، ان کے چہرے پر سجی مسکراہٹ اور ان کی خوشگوار گفتگو ہمیشہ اپنے پن کا احساس دلاتی تھی، ان کی شخصیت میں سادگی، مخلصی، عاجزی وانکساری جیسی صفات کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھیں۔ وہ عزم وحوصلے سے بھرپور شخصیت کے مالک تھے۔ شدید کمزوری کے باوجود کبھی سہارے کی تلاش نہیں کرتے تھے۔ جب وہ دہلی آئے تھے تو علالت اور کمزوری کی وجہ سے اٹھنے بیٹھنے میں بھی بہت دشواری ہو رہی تھی۔ اسلامی اکیڈمی کے ٹیچرز کوارٹر میں داخل ہونے کے لیے دو سیڑھیاں چڑھنی تھیں، بڑی مشکل اور جدوجہد کے بعد چڑھ سکے۔ تھوڑی ہی دیر میں مغرب کا وقت ہوگیا۔ یاسر صاحب اور شمو چچا (عبیدالرحمٰن صاحب) تو مسجد چلے گئے۔ دادا نے ہمارے کمرے ہی میں کرسی پر نماز پڑھی۔ اور نماز پڑھ کر جب اٹھنا چاہا تو کمزوری اور نقاہت کے سبب اٹھ ہی نہ سکے۔ میں نے جلدی سے سہارا دینے کی غرض سے ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی تو یہ کہہ کر منع کرنے لگے کہ نہیں میں اٹھ جاؤں گا، ابھی طاقت ہے مجھ میں، لیکن دادا کی تکلیف کو دیکھتے ہوئے میں نے بہرحال انھیں سہارا دیا، تب وہ بستر تک آسکے۔ شام کی اس ملاقات کے بعد صبح سویرے بھی دادا سے استفادے اور ان کی ہلکی پھلکی خدمت کا موقع ملا۔ اس سفر کے دوران، باوجود اپنی طبیعت کی ناسازی کے، دادا نے بشاشت سے ڈھیر ساری باتیں کیں۔ گھریلو باتوں کے علاوہ بہت سی علمی باتیں بھی کیں، اخبار پڑھتے پڑھتے خبروں پہ مختصراً تبصرہ بھی کرتے جاتے، چھوٹے چھوٹے سوالات بھی پوچھتے اور جب کبھی میری طرف سے ''نہیں معلوم'' یا ''نہیں پتہ ہے'' کا جواب ملتا تو دادا ہنس کر کہتے کہ ''یہ کہنے سے کام نہیں چلے گا اس کا جواب پتہ کر کے بتاؤ۔'' اس طرح کی ہلکی پھلکی باتوں پر اس ملاقات کا اختتام ہوا۔ دادا بلریا گنج نہ آنے کا شکوہ اور جلد آنے کی دعوت دے کر رخصت ہوگئے۔ لیکن اندازہ نہیں تھا کہ دادا اچانک اس طرح ہمیشہ کے لیے دنیا سے رخصت ہوجائیں گے۔

اللہ سے دعا ہے کہ دادا کے اعمال صالحہ کو قبولیت عطا کرے، ان کی لغزشوں سے درگزر فرمائے، ان کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے۔ ان کی آل واولاد اور ان کے کاموں کو ان کے حق میں صدقہ جاریہ بنائے، آمین۔

میرے خالو (ڈاکٹر خلیل صاحب)

ثمینہ شاہ نواز

آج کل میرا قیام دہلی میں ہے، ۲۷ مئی کو اچانک بلریا گنج جانا ہوا۔ دوسرے دن کچھ مصروفیت کی وجہ سے خالہ کے گھر نہیں جاسکی، سوچا اطمینان سے جا کر ملاقات کرلوں گی۔ خالو کی طبیعت ماشاءاللہ ٹھیک تھی۔ ۲۸ کے دن معمول کے مطابق تھے۔ مختلف لوگوں سے ملاقاتیں اور بات چیت کی۔ رات کا کھانا سب کے ساتھ کھایا۔ ۲۸ کی شب بارہ بجے انتقال ہوگیا۔ اللہ غریق رحمت کرے۔ آمین۔ ان سے ملاقات نہ ہونے پر بہت افسوس رہا۔

جامعۃ الفلاح کے اولین معماروں میں سے تھے۔ تعمیر وترقی میں ان کا رول ناقابل فراموش ہے۔ تحریک اسلامی سے بھی ان کا گہرا تعلق رہا ہے۔ مختلف فلاحی ورفاہی اداروں سے ان کی وابستگی تھی۔ ان کی تعمیر وترقی کے لیے ہمیشہ کوشاں رہتے تھے۔

جامعہ کے ناظم اور مہتمم بھی رہے بلکہ ایک وقت ایسا آیا کہ آپ کو جامعہ کی نظامت اور اہتمام دونوں ذمہ داریاں ایک ساتھ ادا کرنی پڑیں۔ آپ نے بحسن وخوبی یہ ذمہ داریاں انجام دیں۔

میرے خالو گوناگوں شخصیت کے مالک تھے۔ عزم کے پختہ، خاموش طبع، ملنسار، مہمان نواز، سادگی پسند، کفایت شعار، علم کے قدرداں اور خدمت خلق۔ خدمت خلق کا جذبہ تو ان کے اندر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا، لوگوں کے کام آنا ان کو پسند تھا۔ دینی تعلیم کے ساتھ عصری تعلیم پر بھی زور دیتے تھے۔

بچپن میں خالہ کے گھر بہت آنا جانا تھا بلکہ بہت زیادہ ہم ان کے گھر رہتے تھے۔ حالانکہ میرا گھر قریب تھا لیکن خالہ کے یہاں رہنا بہت اچھا لگتا تھا۔ خالو مزاجاً سخت نہیں تھے لیکن ہم لوگ خالو کو دیکھ کر چھپ جاتے تھے کہ کہیں کوئی سوال نہ پوچھ لیں۔ اکثر وہ گرامر پوچھتے تھے، اب افسوس ہوتا ہے کہ کاش کچھ سیکھ لیا ہوتا۔

خالو کے یہاں بہت سی بچیوں کی پرورش ہوئی۔ وہ مستقل طور سے ان کے گھر رہتی تھیں۔ ان

بچیوں کے رکھنے کا مقصد ان کی تعلیم و تربیت تھی نہ کہ گھر کے کام کاج۔ ہماری خالہ بھی ان بچیوں کا بہت خیال رکھتی تھیں۔ جہاں جاتیں اپنے ساتھ لے جاتیں۔ خالو ان بچیوں کو اکیلے کام کرتے ہوئے دیکھتے تو برہم ہو جاتے۔ سب کو مل جل کر کام کرنے کے لیے کہتے۔ ان کا کھانا، ان کا سونا سب کے ساتھ تھا۔ وہ بھی گھر کے فرد کی طرح تھیں۔ ان بچیوں کی شادی بھی خالو کے گھر سے ہوئی، اب بھی وقتاً فوقتاً آتی رہتی ہیں۔ ہمارے خالو کی تربیت کا انداز بہت انوکھا اور نرالا تھا۔ ہمارے سر سے دوپٹہ گر جاتا اور ان کو دیکھ کر جلدی سے اپنے سر کو ڈھکنے کی کوشش کرتے تو خالو ہمیں بلاتے اور دوپٹہ اوڑھا کر بتاتے کہ ایسے ڈوپٹہ اوڑھتے ہیں۔ فجر کے وقت سب کو نماز کے لیے جگانا ان کا معمول تھا چاہے وہ بیٹا ہو یا بہو۔ یہ سب میرے بچپن کے واقعات ہیں۔ شادی کے بعد ایک دوسرے سے دور ہو گئے۔ خالہ جب تک تھیں ان کے گھر آنا جانا بہت تھا۔ خالہ خالو کے انتقال کے بعد گھر سونا سونا ہو گیا ہے۔

خالو کے اندر خدمت خلق کا جذبہ اتنا زیادہ تھا کہ انھوں نے ایک ادارہ جس کا نام ''گلشن اطفال'' ہے یتیم بچوں کے لیے کھولا۔ یہ اعظم گڑھ میں یتیموں کی کفالت کے لیے اپنی نوعیت کا پہلا ادارہ تھا۔

دور رہنے کی وجہ سے میرے بچوں سے ان کا تعلق بہت کم رہا لیکن کووڈ میں بچوں کو انھیں قریب سے دیکھنے اور سیکھنے کا موقع ملا۔

۹۲ برس کی عمر میں ان کی رحلت ہوئی۔ جدوجہد اور سعی و عمل سے بھرپور زندگی گزاری۔ تعلیم کے میدان میں ان کی خدمات عظیم ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ ان کی خدمات کا اچھا صلہ دے اور ہمیں ان کا نعم البدل عطا کرے۔

کیا لوگ تھے جو راہِ وفا سے گزر گئے
جی چاہتا ہے نقش قدم چومتے چلیں

اس ایک شخص میں تھیں دلربائیاں کیا کیا!

ڈاکٹر سمیہ ریاض فلاحی

سماج مختلف افکار اور متنوع تہذیب و ثقافت کا آئینہ دار ہوتا ہے جو مختلف خاندانوں سے تشکیل پاتا ہے۔ اس سماج میں بسنے والے ہر فرد کی اپنی شناخت ہوتی ہے جو اسے اوروں سے ممتاز کرتی ہے، مگر سماج کا ہر شخص ان صفات کا حامل نہیں ہوتا کہ اسے قابل اعتنا سمجھا جائے۔ لیکن اسی سماج میں کچھ ایسے افراد بھی پروان چڑھتے ہیں جو اپنی شخصی، ملی، سماجی، مذہبی چھاپ چھوڑ جاتے ہیں اور اپنی جامع شخصیت سے ایسی خاموش خوشبو بکھیر جاتے ہیں جس سے ہر کس و ناکس بلاتفریق یکساں طور پر متاثر ہوتا ہے۔

ایسی ہی ایک ہمہ گیر شخصیت جس نے سماج کے تئیں تعلیمی مہم جاری کی اور تعلیم و تعلم کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ۱۹۳۱ء میں شہر اعظم گڑھ کے ایک قصبہ بلریا گنج میں آنکھ کھولتی ہے، اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک تناور درخت بن کر علاقے کے لوگوں کو سایہ فراہم کرنے لگتی ہے، جسے ڈاکٹر خلیل احمد رحمہ اللہ کے نام سے جانا جاتا ہے۔

ابتدائی تعلیم کے حصول کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں قدم رکھتے ہیں، علی گڑھ کے طبیہ کالج سے ۱۹۵۶ء میں ایک کامیاب معالج بن کر ابھرتے ہیں۔ بالخصوص ماہر امراض اطفال کے طور پر نمایاں ہوتے ہیں۔

وطن واپسی کے بعد ایک جذبہ دل میں ابھرتا ہے، معاملہ محض ذاتی مفاد تک رسائی اور حصول رزق تک محدود نہیں ہوتا ہے، بلکہ ایک متنوع شخصیت کا سہرا ان کے سر باندھتا ہے جو کبھی مؤسس کا درجہ عطا کرتا ہے تو کبھی نظامت کی ذمہ داریاں اٹھانے پر اکساتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک کامیاب معالج ہونے کے باوجود آپ نے زیادہ تر اوقات کبھی جامعۃ الفلاح کے فروغ، دینی تعلیم کی ترقی، بچوں کی اعلیٰ تعلیم و تربیت کے میدان میں صرف کیا اور ایک طویل عرصے تک جامعۃ الفلاح کی نظامت کے

فرائض بھی انجام دیئے جس سے ان کے ایک کامیاب منتظم اور باشعور فرد ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ مولانا طاہر مدنی صاحب ان کے بارے میں رقم طراز ہیں:

''ڈاکٹر صاحب نے ۱۹۵۶ء میں طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے طب کی تعلیم مکمل کی تھی، وہ ایک بہت کامیاب معالج تھے اور بطور خاص ماہر امراض اطفال تھے۔ ان کو فروغ تعلیم سے بہت دلچسپی تھی۔ علی گڑھ سے واپس آنے کے بعد انہوں نے دیگر رفقاء کے ساتھ مل کر بلریا گنج کے قدیم مکتب کو ترقی دینے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ جامعۃ الفلاح کے مؤسسین میں ان کا نام بہت نمایاں ہے اور ادارے کی تعمیر و ترقی میں ان کا گراں قدر حصہ ہے۔ متعدد بار وہ ناظم رہے۔ جامعہ کے نصاب ونظام کی تشکیل میں ان کا بنیادی کردار رہا۔''

وہ آپ کی بالغ نظری اور وسعت فکری کا ذکر کچھ یوں کرتے ہیں:

''مرحوم جامعہ کی شوریٰ کے بنیادی رکن تھے۔ شوریٰ کے اجلاس میں پابندی سے شریک ہوتے تھے، تعلیمی معائنے کرتے تھے اور معیار کی بلندی کے لیے برابر کوشش کرتے تھے۔ ان کا نظریہ تعلیم جدید وقدیم کے سنگم سے عبارت تھا۔ معلّمین ومعلّمات کی فنی ٹریننگ کی طرف توجہ دیتے تھے۔ نوجوانوں کو تعلیم کی طرف متوجہ کرتے تھے اور ان کی تعلیمی رہنمائی کرتے تھے۔ ان کی پوری زندگی تحریک اسلامی اور فروغ تعلیم کے لیے وقف تھی۔''

آپ کا شمار جامعہ الفلاح کے ان مؤسسین اولین میں ہوتا ہے جنہوں نے پر پیچ وادیوں سے گزر کر علوم جدیدہ کے پہلو بہ پہلو دینیات کی تعلیم کا عظیم الشان قلعہ تعمیر کیا۔ اس ضمن میں ڈاکٹر ضیاء الدین ملک فلاحی صاحب لکھتے ہیں:

''قصبہ بلریا گنج کے دانشوروں اور ذمہ داروں نے جب مدرسہ کی توسیع کا فیصلہ لیا اور علوم جدیدہ کے ساتھ دینی تعلیم کا گہوارہ بنانے کا عزم ظاہر کیا تو عمومی لحاظ سے قصبہ بلریا گنج کے تمام ہی باشندگان نے اس مہم میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا جن میں ڈاکٹر خلیل صاحب کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔'' (دیکھیے: تاریخ جامعہ الفلاح، ڈاکٹر ضیاء الدین ملک فلاحی، (کچھ اضافہ وترمیم کے ساتھ، ص: ۶۰)

جامعہ کی تعمیر و ترقی میں ان کا جو بنیادی رول رہا ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ ۶/نومبر ۱۹۶۰ء کی ایک عام میٹنگ میں انجمن تعلیمات دینی کمیٹی کا سکریٹری یا صدر منتخب کیا گیا۔ اور پھر اپنے

اس منصب کا حق ادا کرتے ہوئے موصوف مرحوم نے ۹/دسمبر ۱۹۶۰ء میں دینی تعلیمی کونسل سے جامعہ کا الحاق کرانے میں اہم کردار ادا کیا۔ڈاکٹر ضیاء الدین ملک فلاحی رقم طراز ہیں:

''الحاق کرانے کی کوششوں میں تین سرکردہ ہستیوں کی کوششیں شامل رہی ہیں، محمد اکرام پردھان، حکیم محمد ایوب اور ڈاکٹر خلیل احمد۔ان حضرات نے سکریٹری انجمن تعلیمات دینی اعظم گڑھ سے ملاقات کی اور جامعہ اسلامیہ کا الحاق کرالیا۔'' (ایضاً، ص ۶۱-۶۲)

۵/مئی ۱۹۶۱ء میں جب مجلس عاملہ کی تشکیل ہوئی تو اس میں پندرہ ممبران کا انتخاب عمل میں آیا جن میں سے ایک قابل ذکر نام ڈاکٹر خلیل احمد صاحب کا بھی ہے جنہیں اس مجلس کا خازن بھی مقرر کیا گیا اور تعلیمی کمیٹی کے لیے بھی آپ کو نامزد کیا گیا۔

واضح رہے کہ ۱۹۶۲ء تک اس ادارہ کا نام جامعہ اسلامیہ رہا۔ بعد ازاں ڈاکٹر خلیل احمد صاحب کے مطالبے پر مفتی عبدالرؤف صاحب کے تجویز کردہ دو نام ''جامعۃ الفلاح اور فلاح دارین'' میں سے جامعۃ الفلاح کو جامعہ کے نام کے طور پر منتخب کیا گیا تا کہ یہاں سے فارغ التحصیل طلبہ خود کو اس ادارے سے منسوب کر سکیں۔ (ایضاً، ص:۶۹)

آپ بچوں کے ساتھ مشفقانہ رویہ رکھتے اور ان کے علمی وفکری ارتقاء کے لیے پیہم کوشاں رہتے۔اپنے اس مقصد کے حصول کے لیے بلریا گنج میں گلشن اطفال قائم کیا، جس کے لیے موصوف نے نہ صرف زمین مہیا کرائی بلکہ تاعمر اس کی سرپرستی بھی کی۔رفاہ عامہ کے کاموں میں بھی آپ پیش پیش رہے اور بلریا گنج میں ایک مسجد ''مسجد بلال'' بھی تعمیر کرائی۔

آپ دینی تعلیم کے ساتھ عصری تعلیم کی پرزور وکالت کرنے والے ماہر تعلیم تھے۔اپنی اس فکر کو عملی جامہ پہنانے کے لیے انہوں نے جامعۃ الفلاح کو متعدد عصری یونیورسٹیوں سے جوڑنے کی کوشش کی اور اس کی ذمہ داری اطہر ریحان صاحب کو سونپی، جن کی سنجیدہ کوششیں رنگ لائیں اور آج جامعۃ الفلاح عالمی ادارہ کی شکل میں منظر عام پر آیا۔

اطہر ریحان صاحب آپ کے مزاج کو بیان کرتے ہوئے رقم کرتے ہیں:''ڈاکٹر صاحب عزم کے پختہ، خاموش طبع، ملنسار، کفایت شعار، سادگی پسند اور علم کے قدر دان تھے۔ایک بار گھر رساول کھلانے لے گئے، رساول اور موٹی بالائی کے ساتھ بے حد لطف آیا مگر آخر میں یہ دیکھ کر میری

حیرت کی انتہا نہ رہی کہ کھانے کے بعد پیالے کو دھو کر پیا۔''

آپ کی یہ سادگی ہی تھی کہ علی گڑھ سے ایک کامیاب معالج بن کر لوٹنے کے بعد راقمہ کے نانا شبیر احمد رحمہ اللہ شیخوپور کے اہل خانہ کے علاج معالجہ کے لیے جانے میں کوئی تأمل نہیں کرتے تھے اور اس طرح خدمت خلق کی ادائیگی میں پیش پیش رہتے تھے۔ نیز ۹۰ کی دہائی میں شیخوپور میں مقیم مدرسہ شیخ الاسلام کے مشہور استاد مولانا اعجاز احمد اعظمی رحمہ اللہ کے اہل خانہ کے علاج کے لیے بھی شیخوپور تشریف لے جایا کرتے تھے۔ آپ کی یہ بے لوث خدمت آپ کے طبعی اوصاف کی عکاس ہے۔

اپنے شاگرد یا زیر سرپرستی پروان چڑھنے والے طلبہ کی خاص پذیرائی کرتے تھے اور اس کے لیے محض زبانی جمع خرچ نہیں بلکہ اگر کبھی سفر کی صعوبتیں بھی برداشت کرنی پڑتی تھیں تو آپ بلا تردد وہ بھی اختیار کرتے تھے۔

آپ مضبوط فکر کے مالک، اصابت رائے کے حامل اور فرائض کی ادائیگی میں ایک اصول پسند انسان تھے۔ تنظیمی امور میں بے اصولی کو سخت ناپسند فرماتے تھے۔ لہٰذا اگر کبھی کسی ذمہ دار سے کوئی کام خلاف اصول واقع ہوا تو اس کا سخت ردعمل فرماتے تھے، مگر ساتھ ہی عجز وانکساری کا یہ عالم تھا کہ اگر انھیں اپنے ان احکامات میں کچھ مبنی بر غلط فیصلہ محسوس ہوا تو معذرت کرنے میں کوئی تردد نہیں کرتے تھے، جیسا کہ ۱۹۸۰ء میں انجمن طلبہ قدیم کے پہلے کنونشن کے موقع پر پروگرام کی ذمہ داری اطہر ریحان صاحب کو سونپی گئی۔ انہوں نے اپنے کمرہ میں انجمن طلبہ قدیم کی تختی لگوادی، جس پر بعض لوگوں کو غلط فہمی ہوئی، اس کے بعد ڈاکٹر صاحب اور اطہر ریحان صاحب کے درمیان معمولی سا فکری ٹکراؤ ہوا، مگر بالآخر انھوں نے اپنے فیصلے کو غلط فہمی پر مبنی بتا کر معذرت کر لی۔

اس واقعے سے آپ کی تواضع اور منکسر المزاجی کا پتہ چلتا ہے۔ اسی طرح راقمہ کا بھی ایک ناخوشگوار تجربہ ہوا، جب حج کے لیے جانے پر عربی پنجم کا ششماہی امتحان چھوٹ گیا۔ تو امتحان کی اجازت دلوانے کے لیے جب والد محترم رحمہ اللہ ڈاکٹر صاحب کے دولت کدہ پر تشریف لے گئے تو آپ نے والد محترم کو اپنے دوٹوک موقف سے آگاہ کیا۔ جس کی وجہ سے والد محترم سے تھوڑا مباحثہ ہوا مگر بعد میں عم اطہر صاحب (جو کہ والد محترم کے خاص دوستوں میں سے تھے) کی کوششوں سے راقمہ کو امتحان میں بیٹھنے کی اجازت دے دی گئی، مگر اس وقت بھی آپ نے اپنے اس سخت موقف پر دوبارہ غور

وخوض کر کے اپنی اصابت فکر کا ثبوت دیا۔

آپ چونکہ مختلف رفاہی اداروں سے منسلک، جماعت اسلامی کے رکن نیز جامعہ الفلاح کے رکن شوریٰ بھی رہے۔ لہٰذا ان تمام امور کی ذمہ داریاں نبھانے میں مشاورتی امور پر بلاتفریق رنگ ونسل اور بلا امتیاز چھوٹے بڑے ہر ایک کے مشورے کی قدر کی۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر ملک حبیب فلاحی لکھتے ہیں: ''میری کم سنی اور کم مائیگی کے باوجود مجھ سے جامعہ کی ترقی کے منصوبوں پر میری رائے مانگتے اور میری باتیں سن کر بہت خوش ہوتے! مدینہ منورہ آئے تو میری ملاقات ہوئی تھی۔ اس وقت میں جامعہ اسلامیہ سے فارغ ہو چکا تھا، بہت محبت سے ملے۔ میں ان کو اپنی قیام گاہ پر لے گیا اور ہماری کافی دیر تک بہت سی باتیں ہوئیں۔''

مختلف میدان میں آپ کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ آپ جماعت اسلامی ہند کے قدیم ترین ارکان میں سے تھے۔ اور جماعت کے لیے مقامی سطح پر آپ کی خدمات غیر معمولی تھیں۔ آپ شبلی کالج اعظم گڑھ سے بھی وابستہ رہے، شبلی کالج کی عاملہ کے بھی ایک زمانے تک رکن رہے۔ آپ جامعۃ الفلاح کی مجلس شوریٰ کے تاحیات رکن رہے، ایک طویل عرصے تک مجلس عاملہ کے بھی رکن رہے، جامعہ کے ناظم اور مہتمم بھی رہے۔ آپ صحیح معنوں میں انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح کے سرپرست اور جامعہ، وابستگان جامعہ کے سچے بہی خواہان میں سے تھے۔

۹۲ رسال کی عمر میں ۲۹ رمئی کو جب علم و ہنر کا یہ ستارہ غروب ہوا تو اعظم گڑھ کے علمی حلقوں کی فضا سوگوار ہوگئی۔ مختلف تعزیتی نشستوں کا قیام عمل میں آیا جن میں حاضرین نے موصوف سے اپنی محبت وعقیدت کا اظہار کیا، آپ کی خدمات کو سراہا اور آپ کی رحلت کو امت کے لیے ناقابل تلافی خسارہ قرار دیا۔

دارالمصنفین کے سینئر سربراہ مولانا عمیر الصدیق ندوی نے کہا کہ ڈاکٹر موصوف کی شناخت کامیاب معالج کے ساتھ دینی تعلیم کے فروغ کے لیے کوشاں ایک فرد کی تھی۔ جامعۃ الفلاح کو قائم کرنے، اس کی بنیادوں کو مضبوط بنانے اور اس کے فیض کو ملک گیر بنانے کے سلسلے میں ان کی خدمات کو ہمیشہ یاد کیا جاتا رہے گا۔ انھوں نے کہا کہ مرحوم جامعۃ الفلاح اور جماعت اسلامی ہند دونوں کے لیے ہمہ وقت متفکر اور متحرک رہا کرتے تھے۔ شبلی اکیڈمی سے بھی ان کا گہرا تعلق تھا۔

مولانا رحمت اثری فلاحی مدنی نے مرحوم کی ساری سرگرمیوں کو تعلیم و تربیت اور بچوں کی فلاح کا محور نیز جامعہ کی تعمیر و ترقی میں ان کے مثبت کردار کو ناقابل فراموش سرمایہ قرار دیا۔

مولانا عنایت اللہ سبحانی نے موصوف کی شخصیت کو رات کی تاریکی میں خوشبو بکھیرنے والے پودے کی مانند قرار دیا جو بلاغرض اپنی خوشبو سے ہر ایک کو یکساں طور پر معطر کرتا ہے۔ انھوں نے موصوف کی شخصیت کو سراپا یقیں محکم، عمل پیہم کی مانند قرار دیا جس نے ملک وملت کے نونہالوں اور نوجوانوں کے لیے کارہائے نمایاں انجام دیے۔

آپ کے جامعہ سے خاص لگاؤ اور ان کی بہی خواہی کا ادراک جناب اطہر احسن فلاحی (میرٹھ) کی اس تحریر سے بخوبی ہوتا ہے:

''میری ان سے آخری ملاقات ۱۸/مارچ ۲۰۲۳ء کو صبح بارہ بجے ہوئی تھی۔ ان کے اہل خانہ بھی مجھ سے اور میری فیملی سے بخوبی واقف تھے، اس لیے مجھے کبھی اجنبیت کا احساس نہیں ہوا۔ مختلف موضوعات بشمول جامعہ وتحریک کے تعلق سے کھل کر گفتگو ہوتی تھی اور مخلصانہ انداز میں وہ جامعہ وتحریک میں درآئی خرابیوں پر اپنی تشویش کا کھل کر اظہار بھی کرتے تھے۔ ۱۸/مارچ کو جو گفتگو جامعہ کے تعلق سے ہوئی، اس وقت میں نے ان کو پہلی مرتبہ بے بس پایا۔ اور ان کا یہ احساس سامنے آیا کہ 'گو کہ حالات وواقعات سے میں تشویش میں مبتلا ہوں، پھر بھی اللہ سے دعا گو ہوں کہ حالات معمول پر آجائیں اور جامعہ تعمیر و ترقی کی راہ پر گامزن ہو'۔''

غرض کہ جامعۃ الفلاح کا روح رواں اور میر کارواں اس جہان فانی کو خیر باد کہہ کر اپنے خالق حقیقی سے جاملا۔ آپ کی اس علمی شخصیت کو ہم محض یہ نام دے سکتے ہیں:

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

اللہ ان کی خدمات کو قبول فرمائے، جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور ملت کو ان کا بہترین نعم البدل عطا فرمائے۔ آمین

منظوم خراج عقیدت

شاہد حسن

بڑی ہی لگن سے، برائے فلاح
چلے نیک رستے، عطائے فلاح
بتایا انھوں نے، عداوت بری
مروت، اخوت، قرابت بھلی
تھی مرحوم کی زندگی بے مثال
محبت کا، شفقت کا رکھا خیال
اپنے بھی راضی تھے، بیگانے خوش
ملنسار اتنے کہ انجانے خوش
کسی سے عداوت نہ کی دشمنی
اپنے پرائے سبھی سے بنی
اخوت کا پیکر تو دل کے غنی
سراپا، سراپا وہ دلبر، سخی
تکلم کا انداز سب سے الگ
قلم کا بھی اعجاز سب سے الگ
ہر اک دل میں ان کی محبت بسی
ہوئے ہم سے رخصت ہے لگتی کمی
اٹل ہے قضا، سب کو آنی ہے موت

مگر موتِ عالم ہے عالم کی موت
مرحوم میں یوں تھیں صد خوبیاں
ہر کام سے ان کی خوبی عیاں
وہ بار قیادت، نبھایا سدا
عروج فلاح ان کے دم سے رہا
محبت کا پیکر تھے عالم خلیل
ہو جنت عطا ان کو ربّ جلیل

ڈاکٹر خلیل احمد مرحوم کی رحلت پر
تعزیتی نشست کا انعقاد

مصباح الباری فلاحی

۳۰ رمئی ۲۰۲۳ء بروز سہ شنبہ مولانا ابواللیث ہال میں ایک تعزیتی نشست جناب ڈاکٹر خلیل احمد صاحب مرحوم (سابق ناظم جامعہ) کی یاد میں منعقد ہوئی۔ ڈاکٹر جاوید سلطان فلاحی صاحب (مہتمم تعلیم وتربیت) کی تلاوتِ قرآن سے پروگرام کا آغاز ہوا۔

مولانا انیس احمد مدنی صاحب (صدر مدرّس شعبۂ اعلیٰ طلبہ) نے ڈاکٹر خلیل احمد صاحب مرحوم کا جامعہ سے گہرا تعلق بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ مرحوم تین میقات تک جامعہ کے ناظم رہے، ایک مرتبہ تو نظامت کے ساتھ ساتھ اہتمام کے فرائض بھی انجام دیے۔ مرحوم جامعہ کے تاسیسی رکن شوریٰ تھے۔ بہت ہی کفایت شعار تھے۔

مولانا محمد عمران فلاحی صاحب (معاون مہتمم کلیۃ البنات) نے فرمایا کہ ڈاکٹر خلیل احمد صاحب مرحوم بہت ہی کفایت شعار اور بہت ہی ایماندار تھے۔ جماعت سے جڑنے کے بعد ان کے اندر بہت سادگی آ گئی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کے لوگوں سے تعلقات بہت گہرے تھے۔ آپ نے گلشن اطفال (بلریا گنج) کے لیے اپنی زمین وقف کی اور ایک منزل کی تعمیر کا کام بھی کرایا۔ جامعہ کے تعلیمی معیار کو ہمیشہ بلند دیکھنا چاہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کے درجات کو بلند کرے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔

ماسٹر شہنواز احمد صاحب (ہیڈ شعبۂ ابتدائی طلبہ) نے کہا کہ ڈاکٹر خلیل احمد صاحب سے میرا گہرا ربط رہا ہے۔ ان کا مطمحِ نظر ہمیشہ آخرت رہتا تھا۔ بچوں کی تعلیم کے ساتھ محلے پڑوس کے بچوں کو پڑھانا اور ان کے لیے کتابیں فراہم کرنا بھی ان کا خاص وصف رہا ہے۔ آپ نے محلے کے بچوں کے

لیے ایک چھوٹی لائبریری بھی قائم کی تھی۔

مولانا نعیم الدین اصلاحی صاحب (شیخ التفسیر جامعۃ الفلاح) نے کہا کہ جامعہ کی تعمیر وترقی میں ڈاکٹر صاحب کا ہاتھ سب سے زیادہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے ساتھ میں نے کئی سفر کیے۔ ڈاکٹر صاحب تعلیمات کے ماہر تھے۔ ہر یونیورسٹی کا نصاب ان کے سامنے تھا۔ اسی لیے کسی نے ڈاکٹر صاحب کو پروانچل کا سرسید بھی کہا ہے۔ ڈاکٹر صاحب بڑے امانت دار تھے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، آمین۔

مولانا رحمت اثری فلاحی مدنی صاحب (سابق ناظم جامعہ) نے تعزیتی کلمات میں فرمایا کہ ڈاکٹر صاحب کی ساری سرگرمیاں تعلیم وتربیت اور بچوں کے اردگرد تھیں۔ فلاح سے بھی تعلیم وتربیت کی وجہ سے دلچسپی تھی۔ جامعہ کی تعمیر کے پیش نظر انھوں نے اپنی ساری توجہ اپنے مطب کے بجائے فلاح پر لگادی تھی۔ ڈاکٹر صاحب اب اس دنیا میں نہیں رہے، لیکن ان کا کام ابھی زندہ ہے۔ بقول علامہ اقبالؒ ''موت، تجدید مذاقِ زندگی کا نام ہے''۔

ڈاکٹر خلیل احمد صاحب کے داماد جناب محمد شاہد صاحب نے کہا کہ اخلاص، امانت اور لگاؤ ڈاکٹر صاحب کے خاص وصف تھے۔

ڈاکٹر خلیل احمد صاحب کے پوتے ڈاکٹر خان یاسر صاحب نے کہا کہ دادا کے اندر انکساری بہت زیادہ تھی۔ دادا تہجد گزار تھے۔ دادا کا کہنا تھا آپ جس میدان میں جائیں اسلامی کردار کو سامنے رکھیں۔

ناظم جامعہ مولانا محمد طاہر مدنی صاحب نے تعزیتی کلمات میں فرمایا کہ جامعہ کی تعمیر وترقی میں ڈاکٹر صاحب کا بنیادی کردار رہا ہے۔ جامعہ کا نام جامعۃ الفلاح تو ۱۹۶۲ء میں پڑا، لیکن ۱۹۱۴ء سے یہ تعلیمی مرکز قائم تھا۔ پھر ۱۹۵۶ء میں ثانوی اور اعلیٰ کے درجات شروع ہوئے، اسی زمانے میں ڈاکٹر صاحب علی گڑھ سے تعلیم کے بعد واپس آگئے تھے۔ ۱۹۵۹ء سے یہاں عربی درجات کی تعلیم شروع ہوئی۔ پھر بعد میں مدرسۃ الاصلاح سے کئی اساتذہ آئے اور یہ ادارہ منظّم طریقے سے بہت تیزی سے ترقی کرنے لگا۔ ۱۹۶۳ء میں ڈاکٹر صاحب ناظم جامعہ ہوئے۔ گلشن اطفال کے قیام اور بلریا گنج کی مسجدِ بلال کے قیام میں آپ بہت سرگرم تھے۔ مشہور حدیث ہے کہ اللہ کے رسولؐ نے فرمایا: تین چیزوں کا اجر انسان کو مرنے کے بعد بھی پہنچتا رہتا ہے: ''**صدقة جارية، أو علم ينتفع به، أو ولد صالح يدعو**

لہ"۔ یہ تینوں چیزیں ڈاکٹر صاحب کو الحمدللہ حاصل ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند کرے، آمین۔

مولانا محمد عنایت اللہ اسد سبحانی صاحب (سابق صدر جامعۃ الفلاح) نے تعزیتی کلمات میں فرمایا کہ ایک پودا ''رات کی رانی'' ہے، جو خاموشی سے رات کی تاریکی میں خوشبو پھیلاتا ہے۔ یہی حال ڈاکٹر صاحب کا تھا جنھوں نے خاموشی سے پورے علاقے میں خوشبو پھیلائی، لیکن ان کا نام کم آتا ہے۔ یہ ان کی عاجزی، انکساری، خدا طلبی تھی۔ پوری جوانی جامعہ کی ترقی میں لگائی۔ ڈاکٹر صاحب سے میرا بہت گہرا تعلق رہا۔ ڈاکٹر صاحب جب ناظم تھے مشورے کے لیے مولانا جلیل احسن ندوی صاحب کے پاس آتے تھے۔ ان میں ایمانداری اور خدا ترسی تھی۔ نوجوانوں کی اصلاح کی بڑی کوشش کرتے تھے۔ اللہ کی رضا کی خاطر ڈاکٹر صاحب کبھی اپنے کاموں کا کہیں تذکرہ نہیں کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ ڈاکٹر صاحب کا نعم البدل عطا فرمائے، آمین۔

نظامت کے فرائض مولانا انیس احمد فلاحی مدنی صاحب (صدر مدرّس شعبۂ اعلیٰ طلبہ) نے انجام دیے۔ اس نشست میں شعبۂ اعلیٰ وثانوی کے اساتذہ وطلبہ شریک رہے۔